



عمیرہ احمد

قسط نمبر ۵



میرے پیارے اللہ

آج میں نے بابا کو پھر خواب میں ستارہ بنتے دیکھا۔ جیسے ترکی میں دیکھا تھا۔ تب میں نے انہیں ستارہ بنتے دیکھا تھا پھر وہ آگ کا گولہ بن گئے اور پھر وہ بہت دور چلے گئے۔ آج پھر میں نے انہیں دور جاتے دیکھا اور میری آنکھ کھل گئی۔ بابا کہیں بھی نہیں تھے۔ میں بہت اُداس ہوں۔ بہت زیادہ۔

میں نے آپ کو اپنے بارے میں نہیں بتایا۔ پہلے اپنے بارے میں بتانا چاہیے تھا۔ میرا نام قلبِ مومن ہے۔ آپ کو یاد ہے کئی مہینے پہلے میں آپ کو خط لکھا کرتا تھا۔ تب میں ترکی میں رہتا تھا، اب پاکستان میں رہتا ہوں۔

آپ نے میرے خطوں کے جواب میرے دادا کو بھیجے تھے مگر دادا نے وہ مجھے نہیں دیئے۔ آپ کو میں یاد آگیا نا؟ مجھے پتہ تھا میں آپ کو یاد آ جاؤں گا کیونکہ مئی کہتی ہیں آپ کبھی کوئی چیز بھول ہی نہیں سکتے خاص طور پر اُن کو جو آپ سے پیار کرتے ہوں اور میں تو آپ سے بہت پیار کرتا ہوں۔۔۔ دیکھیں میں نے آپ کے لئے hearts بھی بنائے ہیں۔ اور ہمیشہ کی طرح اس خط پر پھول اور ستارے بھی بنائے ہیں۔ رنگین pencils سے۔۔۔

آپ سوچتے ہوں گے اگر میں آپ سے اتنا پیار کرتا ہوں تو پھر آپ کو اتنے مہینوں سے خط کیوں نہیں لکھتا رہا۔ میں آپ کو بھولا نہیں ہوں بس پاکستان آگیا ہوں لیکن آپ سے روز باتیں کرتا ہوں رات کو بستر پر لیٹ کر سونے سے پہلے۔ جب سپارہ پڑھتا ہوں تب بھی آپ کو یاد کرتا ہوں اور جب نماز پڑھتا ہوں تب بھی۔۔۔ نماز ساری نہیں پڑھتا اور روز بھی نہیں پڑھتا، لیکن سیکھ رہا ہوں آپ ناراض مت ہونا مجھے پتہ ہے آپ ناراض نہیں ہوں گے کیونکہ میں بچہ ہوں اور آپ بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ہم اب بہت بڑے گھر میں رہتے ہیں لیکن میں یہاں خوش نہیں ہوں۔ مجھے اپنا سکول یاد آتا ہے۔ اپنے دوست بھی اور وہ جنگل بھی جہاں میں آپ کے لئے خط چھوڑ کر آتا تھا۔ میں نے یہاں بھی ایک جگہ ڈھونڈ لی ہے جہاں میں آپ کے لئے خط چھوڑ سکتا ہوں۔

میرے پیارے اللہ میرا دل پاکستان میں نہیں لگتا یہاں اب ہمارے پاس وہ سب کچھ ہے جو

میں آپ سے مانگتا تھا۔ بڑا سا گھر، گاڑی اور وہ ساری چیزیں جو میں آپ سے مانگتا تھا۔ وہ می مجھے بازار سے لے دیتی ہیں۔ سب کچھ مل گیا ہے مجھے لیکن می کھو گئی ہیں۔ یہ میری والی می نہیں ہیں۔ وہ الگ کمرے میں رہتی ہیں اور میں الگ کمرے میں اور کبھی کبھی وہ کئی دن گھر بھی نہیں آتیں۔ مجھے لگتا ہے انہیں اب میری اور بابا کی پروا نہیں ہے۔ وہ اب بابا کو miss نہیں کرتیں۔ اُن کے لئے پہلے کی طرح روتی بھی نہیں ہیں۔ اب بہت اچھے اور مہنگے کپڑے پہنتی ہیں۔ زیور بھی، میک اپ بھی۔۔۔۔ اور وہ بہت ہنستی ہیں۔۔۔۔ بہت بہت زیادہ۔۔۔۔ کبھی کبھی وہ اتنا ہنستی ہیں کہ مجھے اُن پر غصہ آتا ہے۔

مجھے اُن کے بارے میں بہت ساری خراب باتوں کا بھی پتہ چل گیا ہے لیکن وہ میری می ہیں اس لئے میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ اس کے لئے Sorry۔
مجھے اب بابا بہت یاد آتے ہیں اور دادا بھی۔

میرے پیارے اللہ کیا آپ مجھے اُن دونوں کے پاس ترکی نہیں بھیج سکتے۔ میرا دل می کے پاس نہیں لگتا۔ وہ مجھے ایک چڑیل لگتی ہیں۔ مجھے پتہ ہے مجھے می کو یہ نہیں کہنا چاہیے لیکن مجھے اُن پر غصہ آتا ہے۔ مجھے لگتا ہے انہوں نے میرے بابا کو جان بوجھ کر ناراض کیا ہے۔ اگر وہ ترکی میں رہتیں تو بابا مل جاتے۔ میں خود ڈھونڈ لیتا اُن کو۔ مجھے ہر کھوجانے والی چیز کو ڈھونڈنا آتا ہے۔

میرے پیارے اللہ میں نے آپ سے کہا تھا آپ میری می اور بابا کی صلح کروادیں اور ہم سب اکٹھے رہیں لیکن آپ نے مجھے جو جواب بھیجا تھا وہ دادا نے مجھے نہیں دیا۔ اور اب دادا بھی کہیں گم ہو گئے ہیں۔

میں بہت اُداس ہوں یہاں پاکستان میں۔ آپ کو خط اس لئے لکھ رہا ہوں تاکہ آپ میرے لئے کچھ کریں۔

کیا آپ میرے پر اُگا سکتے ہیں تاکہ میں اُڑ کر ترکی چلا جاؤں اور می مجھے ڈھونڈتی رہ جائیں؟ مجھے پتہ ہے آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ کب مجھے اپنے بابا اور دادا سے ملوائیں گے۔۔۔؟ جلدی ملوادیں۔۔۔ میں بڑا ہو گیا تو وہ مجھے نہیں پہچانیں گے۔ اب میں سونے لگا ہوں۔ آپ بھی سو جائیں۔

آپ کا
قلبِ مومن

بستر پر لیٹے رات کے اُس پچھلے پہر اُس کا جسم کچھ دیر جھٹکے کھاتا رہا تھا یوں جیسے وہ نیند میں کسی چیز سے ڈر رہا تھا اور پھر یک دم اُس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ یک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ کمرے میں نائٹ بلب کی روشنی تھی اور بہت دور سے کسی میوزک کی آواز آرہی تھی۔ کچھ عورتوں اور مردوں کے تہقہوں کی بھی۔

قلبِ مومن بستر سے نکل آیا۔ اُس نے کمرے کی لائٹ آن کر لی تھی۔ باہر سے آنے والی میوزک کی اور اُن تہقہوں کی آوازوں کا اب وہ عادی ہو چکا تھا۔ وہ اُن کی وجہ سے نہیں جاگا تھا اور نہ ہی وہ آوازیں بھی اُس کی نیند کو روک سکتی تھیں۔

وہ بہت بڑا اور آرام دہ کمرہ تھا جس میں وہ اس وقت موجود تھا۔ وہاں بہترین فرنیچر تھا اور کوئی بھی بچہ اُس کمرے میں رہ کر خوش ہوتا۔ اپنے بستر سے اُٹھ کر وہ کمرے میں دیوار کے ساتھ پڑی ایک سٹڈی ٹیبل پر جا بیٹھا تھا۔ دراز کھول کر اُس نے ایک رائٹنگ پیڈ نکالا اور پھر لیمپ آن کر لیا۔ کاغذ پر وہ کچھ لکھنے لگا تھا۔ وہی سب کچھ جو وہ رات کے اس پہر اس طرح خواب میں ڈر جانے پر لکھتا تھا۔۔۔ اللہ تعالیٰ کے نام ایک اور خط۔۔۔ وہ خط شاید اُس کی روح میں کہیں بہت پہلے لکھے گئے تھے جواب اُس پر اتر رہے تھے۔۔۔ قلبِ مومن کو ہر بات پر صرف اللہ یاد آتا تھا۔۔۔۔۔ خوش ہونے پر بھی، خفا ہونے پر بھی، کوئی چیز مل جانے پر، اور کچھ کھودینے پر کسی چیز کی طلب ہونے پر اور کسی چیز کو پانا سکے پر۔۔۔

اُس کا خاندان کئی نسلوں سے اللہ کے ناموں کی خطاطی کرتا آیا تھا، پر قلبِ مومن کو خطاطی نہیں کرنی تھی خط لکھنے تھے۔۔۔۔۔ اللہ کے ناموں اور اُس کی آیات کی خوبصورتی نہیں بیان کرنی تھی۔۔۔۔۔ اُس سے باتیں کرنی تھیں اور باتوں کا وہ سلسلہ ترکی سے پاکستان آ کر رُک گیا تھا۔۔۔۔۔ کئی مہینے رُکارہا تھا اور پھر دوبارہ شروع ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ وہ تنہا رہ گیا تھا۔۔۔۔۔ اور اُداس بھی۔۔۔۔۔ اور ناخوش بھی۔۔۔۔۔ اور ناراض بھی۔۔۔۔۔ اور اُس کے پاس اللہ کو لکھنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ پہلے اُس کے خطوں میں شکوے اور شکایتیں نہیں ہوتی تھیں صرف ضرورتیں ہوتی تھیں۔۔۔۔۔ اب ضرورتیں پوری ہو گئی تھیں تو اُن کی جگہ شکووں اور شکایتوں نے لی تھیں۔ مگر مومن کو اللہ سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ اُس کے سارے شکوے حسنِ جہاں سے تھے۔ اُس کی مُمی سے۔



وہ بڑی احتیاط سے گھر کے مین دروازے سے عقبی لان میں نکلا تھا۔ وہاں ایک درخت پر اُس نے وہ لیٹر باکس کچھ ہفتوں پہلے ہی اسی طرح رات کو لٹکایا تھا تاکہ کسی کو اُس کے بارے میں پتہ نہ چل

سکے۔ عقبی لان کی باڑھ کے پار سوئمنگ پول کے گرد اس وقت وہ پارٹی جاری تھی جس کا شور اُس کے کمرے تک آرہا تھا اور باہر لان میں وہ شور بہت بڑھ گیا تھا۔

قلبِ مومن کو اُس باڑھ کے سامنے سے گزر کر لان کے آخر میں آم کے اُس درخت تک جانا تھا جس پر اُس نے وہ لیٹر باکس لٹکایا ہوا تھا۔ اُس قد آدم باڑھ کے سامنے سے گزرتے ہوئے مومن نے باڑھ کے درمیان جگہ جگہ چھوٹے بڑے سوراخوں سے پول کے ارد گرد موجود مردوں اور عورتوں کو شراب کے گلاسز، کپڑے، جھومتے دیکھا وہ وہاں رُکا نہیں۔

آم کے درخت کے نیچے اندھیرا تھا۔ اُس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا لفافہ اپنے دانتوں میں دبایا اور درخت پر چڑھنے لگا۔ اُس درخت پر چڑھ چڑھ کر اُسے اُس پر چڑھنے کی اچھی خاصی پریکٹس ہو گئی تھی۔ وہ چند ہی منٹوں میں درخت کی ایک اونچی والی شاخ پر تھا اور اُس شاخ پر بیٹھ کر اُس نے سوئمنگ پول کے دوسری جانب دیکھا۔ وہاں بہت سارے مرد اور عورتیں جھوم رہی تھیں لیکن ناچنے والی عورت صرف ایک تھی اور وہ حسنِ جہاں تھی۔ تیز بے ہنگم موسیقی کے ساتھ ناچتے ہوئے وہ مومن کو بہت بُری لگی اور اُس نے اُس سے نظریں چرائیں اور اپنے سر پر موجود ایک دوسری شاخ کے ساتھ بندھے لیٹر باکس میں اپنے منہ میں دبایا لفافہ نکال کر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کا پاؤں یک دم سِلپ ہوا۔ اُس نے شاخ پکڑ کر سنبھلنے کی کوشش کی۔ وہ ناکام ہوا اور پھر خوف کے عالم میں اُس نے اپنے آپ کو اُس اوپر کی شاخ سے نیچے گرتے پایا۔ اُس نے بے اختیار ایک چیخ ماری تھی۔ زمین پر گرتے ہوئے اُس نے ہوا میں اڑتے اُس لفافے کو دیکھا جو ایک لمحہ کے لئے باہر گیٹ پر لگی روشنیوں میں آسمان سے نیچے گرتا نظر آیا تھا اور پھر قلبِ مومن کو ہوش نہیں رہا تھا۔



اُس کی آنکھ جب دوبارہ کھلی تھی تو وہ اپنے بستر میں تھا اور اُس کا بازو ایک پلاسٹر میں لپٹا ہوا تھا۔ درد کی ایک لہر اُس کے بازو میں اُٹھی تھی مگر اُس سے زیادہ گہری وہ شرمندگی تھی جو اُسے حسنِ جہاں کو اپنے سٹڈی ٹیبل پر بیٹھے اُن خطوں کو پڑھتے دیکھ کر ہوئی تھی۔

”آپ نے میرے لیٹرز کیوں پڑھے؟ یہ آپ کے لئے نہیں تھے۔“ وہ بے اختیار ماں پر خفا ہوا تھا اور اُس کی آواز پر کرسی پر بیٹھی حسنِ جہاں نے پلٹ کر اُسے دیکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں کوئی ایسا تاثر تھا جس نے قلبِ مومن کے غصے اور خفگی کو پل بھر میں غائب کیا تھا۔

”تم دادا کے پاس جانا چاہتے ہو؟“ وہ کرسی سے اُٹھ کر اُس کے بستر پر اُس کے پاس آ کر بیٹھ

”نہیں۔۔۔۔ میں بابا کے پاس جانا چاہتا ہوں۔“ اُس نے لیٹے لیٹے ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ اُسے دیکھتی رہی پھر اُس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”تم اُن کے پاس نہیں جاسکتے۔“ ”وہ تو آسکتے ہیں۔“ قلبِ مومن نے بے ساختہ کہا تھا۔ ”وہ بھی نہیں آسکتے۔“ اُسے وہم ہوا اُس نے حسنِ جہاں کی آنکھوں میں پانی دیکھا تھا۔ پانی ہی ہو سکتا تھا آنسو تو نہیں ہو سکتے تھے۔

”کیوں نہیں آسکتے؟“ وہ بے چین ہوا۔ ”اس لئے نہیں آسکتے کیونکہ آپ سے ایک غلطی ہوئی ہے اور وہ آپ کو معاف نہیں کر سکتے۔“ مومن کو جیسے کئی بار دہرائی بات یاد آئی۔ حسنِ جہاں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ”تمہارے بابا اللہ کے پاس چلے گئے ہیں۔“ ”مجھے پتہ ہے اسی لئے میں نے اللہ کو لیٹرز لکھے ہیں۔“ قلبِ مومن نے بھی اُسی اطمینان سے کہا تھا۔ وہ اُس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اُس نے مومن کا وہ ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تھا جو پلاسٹر میں جکڑا ہوا نہیں تھا۔

”تم بابا کو ستارہ بنتے دیکھتے تھے نا؟ تمہارے بابا واقعی ستارہ بن گئے ہیں۔۔۔۔ آ نہیں سکتے وہ اب ہمارے پاس۔“ قلبِ مومن نے اُس کی آواز بڑی دقت سے سنی تھی۔ وہ بہت مدہم آواز میں بول رہی تھی یوں جیسے وہ یہ سب کہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ دہرانا بھی نہیں چاہتی تھی۔

”ہم بھی نہیں جاسکتے؟“ قلبِ مومن الجھا۔ ”تم نہیں۔۔۔۔ شاید میں چلی جاؤں۔“ اُس نے ماں کو کہتے سنا وہ یک دم خوف کے عالم میں اٹھ کر ماں سے لپٹا تھا۔ حسنِ جہاں سے نفرت کرنے کے باوجود ناراض اور خفا ہونے کے باوجود۔

”میں آپ کو کبھی جانے نہیں دوں گا۔“ وہ حسنِ جہاں سے لپٹ کر کہتا جا رہا تھا۔ ”تم دادا کے پاس چلے جاؤ مومن۔“ وہ اُس سے کہہ رہی تھی۔ مومن اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اندازہ کر سکتا تھا۔ وہ اس بار آنسو بہا رہی تھی پانی نہیں۔

”نہیں میں دادا کے پاس نہیں جاؤں گا، آپ کے ساتھ رہوں گا۔“ اُس نے ماں سے وعدہ کیا تھا یا شاید اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا۔



”کوئی جواب آیا؟“ ”نہیں۔“ ”میں نے پہلے ہی کہا تھا۔“ ”تم کو یقین ہے وہ خط اللہ کو مل گئے ہوں گے؟“ ”ہاں مل تو گئے ہوں گے اللہ کو سب مل جاتا ہے۔“ ”کتنے خط بھیجے ہیں تم نے اللہ کو؟“ ”30“ ”یہ تو بہت سارے ہیں۔“ ”اللہ کو جواب تو دینا چاہیے۔“ ”ہاں ٹیچر کہتا تھا۔ اللہ سب کی سنتا ہے

اور سب کو جواب بھی دیتا ہے۔“ مومن نے اس بارے بے حد یقین سے کہا تھا۔ وہ اُس دن سکول کے گراؤنڈ میں اپنے دو قریبی دوستوں کے ساتھ بیٹھا اپنا یہ راز شیئر کر رہا تھا جو وہ عام طور پر نہیں کرتا تھا اور وہ دونوں بچے بے حد پر جوش اور Fascinated اُن خطوں کے بارے میں سُن رہے تھے جو مومن نے اللہ کو بھیجے تھے۔

”تم لوگ کسی کو بتانا مت۔“ اُن سے بات کرتے کرتے مومن کو ہر بار کی طرح اُنہیں خبردار کرنا یاد تھا۔ دونوں نے بیک وقت نفی میں سر ہلا کر اُس سے راز نہ کھولنے کا وعدہ کیا تھا۔

”مومن اگر اللہ نے کبھی بھی answer نہ کیا تو۔“ اُن دونوں بچوں میں سے ایک ردانے اُس سے پوچھا تھا۔ ”وہ ضرور کریں گے۔“ مومن نے بے حد یقین اور اعتماد سے کہا تھا۔ ”ہاں مومن لیکن اگر جواب نہ آیا تو؟“ اس بار دوسرے بچے بلال نے بھی جیسے اُس بچی کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

”پھر میں اللہ سے خفا ہو جاؤں گا۔“ مومن نے یک دم اپنا پلاسٹر میں لپٹا بازو گود میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”اور خفا ہو کر پھر تم کیا کرو گے؟“ ردانے کو پھر تجسس ہوا۔ قلبِ مومن اُن کے لئے پراسرار چیز تھا۔

”میں دوبارہ اللہ کو کبھی خط نہیں لکھوں گا۔“ اُس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ دونوں بچوں کو جیسے تسلی نہیں ہوئی۔ ”بس؟“ ردانے دوبارہ پوچھا۔ ”ہاں اور میں نماز بھی نہیں پڑھوں گا۔ دُعا بھی نہیں کروں گا۔“ مومن نے جیسے مزید بتایا۔ ”بس؟“ اُن بچوں کی جیسے ابھی بھی تسلی نہیں ہو پارہی تھی۔ ”اور ہمیشہ جھوٹ بولوں گا اور بُرے کام کروں گا۔“ مومن نے اس بار پہلے سے بھی زیادہ سنجیدگی سے کہا۔

ردا اور بلال نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ردانے بڑی ہمدردی سے اپنے لچ بکس میں سے لچ کھاتے ہوئے اُس سے کہا۔

”میں دُعا کروں گی تمہیں اپنے لیٹر کا جواب ضرور ملے۔“

ردانہ بھی کہتی تو بھی مومن کو یقین تھا اُسے اللہ تعالیٰ خط کا جواب ضرور دیں گے۔ وہ دیر کر سکتے ہیں لیکن اُسے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔



”آپ نے پہلے کبھی میری برتھ ڈے اس طرح سیلبریٹ نہیں کی۔“ غبارے پکڑے مومن ہنستا کھلکھلاتا حسنِ جہاں کے پاس آیا تھا جو پول سائیڈ پر ہونے والی مومن کی اُس برتھ ڈے پارٹی کے سارے انتظامات کو خود دیکھ رہی تھی اور مومن حیران تھا لیکن حیران سے زیادہ خوش تھا۔

درخت سے گرنے والے حادثے کے بعد اچانک ہی حسنِ جہاں اُسے زیادہ توجہ دینے لگی تھی

اور مومن کو لگتا تھا جیسے اُس کی مُمی واپس مل گئی ہیں۔ وہی والی مُمی جو ترکی میں تھیں۔

”ہاں بس اس بار دل چاہا تمہاری برتھ ڈے بڑی دھوم دھام سے مناؤں تاکہ تمہاری مجھ سے ناراضگی ختم ہو جائے۔“ حسن جہاں نے اُسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا تھا۔ مومن نے پرفیوم کی تیز خوشبو محسوس کی۔ اُس کا دل چاہا وہ حسن جہاں سے کہے اُسے اپنی ماں کی خوشبو سونگھنی تھی جب وہ ترکی میں پرفیوم نہیں لگاتی تھی اور وہ اُس کو اپنے ساتھ لپٹاتی تھی تو مومن کو حسن جہاں کے وجود سے اُٹھنے والی خوشبو عجیب انداز میں محسوس کرتی تھی۔ اُس کے نرم گرم وجود سے پھوٹی ہوئی حسن جہاں کی اپنی خوشبو جسے مومن لاکھوں خوشبوؤں میں بھی پہچان سکتا تھا۔

”تمہارے دوست کب آرہے ہیں؟“ حسن جہاں نے اُسے ساتھ لپٹاتے ہوئے پوچھا۔
 ”پتہ نہیں میں wait کر رہا ہوں۔“ مومن نے اسی طرح اُس سے لپٹے لپٹے کہا۔ بڑے عرصہ کے بعد وہ اس طرح اُس کے ساتھ تھی اور کوئی نہیں تھا۔ سلطان بھی نہیں جو ہر وقت حسن جہاں کا سایہ بنا رہتا تھا۔
 ”سنو مومن۔“ وہ اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ”اپنے دوستوں کے سامنے میرا نام۔۔۔۔۔“ مومن نے روانی میں اُس کی بات کاٹی۔ ”جی نام لوں گا آپ کو حسن جہاں کہوں گا مُمی نہیں کہوں گا مجھے یاد ہے نانی نے جو بھی کہا تھا۔“ اُس نے ممتاز کا پڑھایا ہوا سبق دہرایا تھا۔ ”نہیں مومن میرا نام مت لینا مجھے مُمی کہنا۔“ مومن نے یک دم حیران ہو کر اُس سے لپٹے لپٹے سر اٹھا کر حسن جہاں کو دیکھا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ پہلی بار مومن کو اُس کا میک اپ بھی اچھا لگا تھا۔ وہ اُس میک اپ زدہ چہرے میں بھی اپنی ماں کو پہچان پارہا تھا۔

”مومن۔“ وہ ردا کی آواز پر یک دم پلٹا تھا۔ وہ اپنے پیرٹس کے ساتھ پول کی دوسری سائیڈ پر کھڑی ہاتھ ہلا رہی تھی۔ مومن نے یک دم حسن جہاں کا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔ ”میرے دوست آگئے آئیں میں آپ کو ملواؤں۔“ وہ حسن جہاں کو جیسے بے حد خوشی اور جوش کے عالم میں کھینچتے ہوئے پول کی دوسری سائیڈ پر لے گیا تھا جہاں ردا اپنے ماں باپ کے ساتھ کھڑی تھی اور اُس کے ماں باپ کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ حسن جہاں کو دیکھتے ہی غائب ہوئی تھی۔

”ہمیں پتہ ہی نہیں تھا کہ قلب مومن آپ کا بیٹا ہے۔“ انہوں نے ابتدائی علیک سلیک کے بعد کھڑے کھڑے حسن جہاں سے کہا۔ ”مومن کے پاپا سے بھی ملوائیں۔“ مومن نے ردا کی مُمی کو کہتے سنا اور اُس نے حسن جہاں کا چہرہ دیکھا جس پر بادل آئے تھے۔ گہرے، کالے بادل اور اُن بادلوں نے اُس خوشی اور حسن جہاں کی مسکراہٹ کو سب سے پہلے نگلا تھا۔ مومن نے پلٹ کر ردا کی مُمی اور بابا کو دیکھا وہ

اُنہیں اپنے بابا کے بارے میں بتانا چاہتا تھا سب کچھ۔۔۔ اُن کی کیلی گرائی کے بارے میں اُن کے قص کے بارے میں اور اُس محبت کے بارے میں جو وہ مومن سے کرتے تھے اور مومن کی ممی سے بھی۔۔۔۔۔ لیکن وہ بتا نہیں سکا۔ ردا کی ممی اور بابا اُس کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ وہ بچہ تھا۔ اُن کو بڑوں سے جواب چاہیے تھا اور بڑوں کے پاس اس وقت جو بھی جواب تھا وہ اُنہیں جھوٹ لگا تھا۔



وہ مومن کی زندگی کی سب سے یادگار سالگرہ تھی۔ اُس سالگرہ پر اُس کے سب دوست آئے تھے اور اُسے بہت سارے تحفے ملے تھے۔ اتنے تحفے کہ اُس کا کمرہ بھر گیا تھا اور ان میں سے بہت سارے تحفے وہ تھے جو حسن جہاں نے اُسے دیئے تھے۔ اور ممی اُس شام سارا وقت مومن کے ساتھ رہی تھی۔ اُس کے دوستوں کے ساتھ کھیلتی رہی تھی۔ وہ قلب مومن کے لئے ایک خوابوں جیسا دن تھا۔ خوبصورت خوابوں جیسا۔ وہ زندگی ویسی ہی گزرا نا چاہتا تھا جیسی وہ ایک شام تھی۔

اگلادن اُس کی زندگی کے بھیانک دنوں میں سے ایک تھا۔ سکول میں اُسے اپنے کلاس فیلوز اور دوستوں کے رویے میں کچھ عجیب تبدیلی محسوس ہوئی تھی۔ اُن کے انداز میں ایک عجیب سی ٹھنڈک تھی یا شاید حقارت۔ وہ بچہ تھا لہجہ پہچان سکتا تھا۔ لیبل نہیں لگا سکتا تھا۔ کیونکہ اُس کے پاس اس عمر میں وہ لیبل نہیں تھے جو صرف بڑوں کو تجربہ اور زندگی دیتی ہے اور جس کے بل بوتے پر وہ کسی کی زندگی بھی داغدار کر سکتے تھے۔

”میں کب سے تم دونوں کو ڈھونڈ رہا ہوں مجھے چھوڑ کر یہاں لنچ کرنے آگئے تم۔“ وہ لنچ بریک میں ردا اور بلال دونوں کو ڈھونڈتا رہا تھا اور بالآخر اُس نے اُنہیں گراؤنڈ کی ایک بینچ پر دیکھ ہی لیا تھا۔ وہ اُن دونوں کے درمیان بینچ پر بڑے گھمنڈ سے آکر بیٹھا تھا اور اُس نے اپنا لنچ باکس کھولا تھا اور تبھی اُس نے دائیں بائیں بیٹھے بلال اور ردا کو بینچ سے کھڑے ہوتے دیکھا۔ مومن نے حیرانی سے اُنہیں دیکھا۔

”اب ہم کبھی تمہارے ساتھ لنچ نہیں کریں گے۔“ ردا نے کچھ خفگی سے اُس سے کہا تھا۔ ”کیوں؟“ وہ حیران ہوا۔ ”بلکہ بات بھی نہیں کریں گے۔“ ”ساتھ بھی بیٹھیں گے۔“ اُس کے سوال کا جواب نہیں ملا تھا البتہ اُن دونوں نے کسی میکائیکی انداز میں جملے دہرانے شروع کئے تھے۔ وہ اُن کا منہ دیکھنے لگا تھا۔ لنچ کرنا وہ بھول گیا تھا۔ ”کیوں؟“

”کیونکہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ تمہارے کوئی بابا نہیں ہیں۔“ ردا نے اُسی انداز میں کہا تھا۔

"And your mom is a bad woman." بلال نے بے حد حقارت سے کہا۔ مومن

کا چہرہ سرخ ہوا۔۔۔۔۔ "No she is not....."

"Yes she is..." بلال نے اُسی انداز میں کہا۔ "میری مُمی نے بتایا ہے کہ تمہاری مُمی ڈانسر

ہے اور بُری عورت ہے۔" ردانے اُس کے سامنے کھڑے کھڑے ہاتھ کے اشارے سے اُسے بے حد غصے سے بتایا تھا۔ قلبِ مومن کو یک دم لگا وہ اُن دونوں کے سامنے چیونٹی بن گیا تھا۔ کل شام کا ہاتھی نہیں رہا تھا۔ حقیر، معمولی ہو گیا تھا۔ اُس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ اُس کے حلق سے آواز نہیں نکلی۔

"اللہ تو کبھی تمہارے خطوں کے جواب نہیں دے گا کیونکہ تمہاری مُمی ایک بُری عورت ہے۔"

ردانے جاتے جاتے اُس سے کہا تھا۔ قلبِ مومن کا پنپنے لگا تھا یوں جیسے اُسے بخار ہو گیا تھا یا اُس نے کوئی بھوت دیکھ لیا تھا۔ اُس کے دوست اب اُسے چھوڑ کر جا رہے تھے اور اُسے لگ رہا تھا اُسے ساری دُنیا نے چھوڑ دیا تھا اور یہ سب اُس کی مُمی کی وجہ سے ہوا تھا۔ حسنِ جہاں کی وجہ سے۔۔ اُس کے ڈانس کرنے کی وجہ سے۔۔ اُسے حسنِ جہاں سے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔۔

☆.....☆.....☆

"مجھے دادا کے پاس جانا ہے مجھے آپ کے پاس نہیں رہنا۔ مجھے آپ کے گفٹس بھی نہیں

چاہیے۔ آپ بھی نہیں چاہیے۔" I hate you Mummy... You are a bad woman.

اُس دن گھر آ کر وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اُس نے کمرے میں پڑا ہوا اپنا ہر تحفہ ہر کھلونا توڑ دیا تھا۔ حسنِ جہاں نے اُسے سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ وہ مکے اور لاتیں چلانے لگا تھا یوں جیسے وہ اپنا سارا غصہ سارا زہر ماں کو دے دینا چاہتا تھا۔ حسنِ جہاں نے بالا آخر اُسے چھوڑ دیا تھا۔ وہ عدالت میں کھڑی کسی مجرم کی طرح قلبِ مومن کی عدالت میں کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔

Mummy I hate you.

Mummy I hate you.

وہ روتا بلکتا کہتا جا رہا تھا۔

"مجھے دادا کے پاس جانا ہے۔ مجھے ترکی جانا ہے۔"

حسنِ جہاں نے اُس کے سامنے سر جھکا لیا تھا۔ پیارا اُس کی قسمت میں ہی نہیں تھا نہ ہی اُس

کے ہاتھ کی لکیروں میں، طحہ کا تھا تو کیسے مل جاتا قلبِ مومن کا تھا تو کیسے رہ جاتا۔

☆.....☆.....☆

کیا نغمہ ساز تھی! کیا مہربان وجود تھا! کیا وہم و گمان سے پہرے کا معجزہ تھا۔۔۔ فیصل تھا وہ جو ثریا کے ساتھ اندر کمرے میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا اور اُس کی آواز تھی جس کو سچ ماننے پر وہ تیار نہیں تھی اور اب دروازے کے بچوں بچ کھڑی اُسے ہونٹوں کی طرح دیکھتی وہ جیسے اُسی کالج گراؤنڈ میں آن کھڑی ہوئی تھی جہاں وہ دونوں روز ملتے تھے اور اُس کے آنے پر وہ روز اسی طرح کھڑا ہوتا تھا جس طرح اس وقت کھڑا ہو گیا تھا۔

”السلام علیکم۔“ مومنہ کو اچانک یاد آیا یہ فیصل کی بجائے اُسے کہنا چاہیے تھا۔ باہر سے وہ اندر آئی تھی۔ ”وعلیکم السلام۔“ مدہم آواز میں اُس پر نظریں جمائے وہ بولی تھی۔ ”میں نے کہا تھا نا مومنہ تمہیں دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔۔ بیٹا بیٹھو ذرا میں فیصل کے لئے چائے لے آؤں۔“ ثریا نے اُس کا چہرہ دیکھا پھر فیصل کا اور پھر وہ اُس سین میں سے نکل گئی تھی۔ سٹیج کی ایک سمجھدار اداکارہ کی طرح۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو خاموشی کے عالم میں اور بے وقوفی کی کیفیت میں دیکھتے رہے۔۔۔ جذباتی ہوئے بغیر۔۔۔ پرانے دوستوں کی طرح۔۔۔ جو لفظوں سے زیادہ خاموشی کو پڑھتے ہیں اور لفظوں کے درمیان آنے والے خاموشی کے وقتوں کا انتظار کرتے ہیں کیونکہ جو اُن میں کہا جاتا ہے وہ لفظوں میں کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

”قصیٰ سے پتہ چلا مجھے جہانگیر کے بارے میں۔۔۔ اتفاقاً بات ہوئی تو۔۔۔ بڑا افسوس ہوا مجھے۔۔۔ میں سمجھتا تھا وہ ٹھیک ہو رہا تھا۔“ وہ بالا آخر بولا تھا۔ ٹراؤزرز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ نظریں اُس پر جمائے۔

”ہاں ہم بھی یہی سمجھ رہے تھے بیٹھو۔“ مومنہ کو یقین نہیں آیا وہ اُس سے جذباتی ہوئے بغیر کیسے بات کر پار ہی تھی۔ وہ واپس مڑ کر اُسی کرسی پر بیٹھ گیا تھا جہاں پہلے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر اُس کرسی پر بیٹھ گئی تھی جہاں ثریا بیٹھی ہوئی تھی۔

خاموشی کا ایک اور لمبا وقفہ آیا پھر اُس نے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں تھا تم آؤ گے۔“

”اتنا کمزور تعلق تو نہیں تھا ہمارا کہ دُکھ سکھ میں بھی نہ مل پاتے۔“ اُس نے بغیر تامل کئے کہا تھا۔

مومنہ نے سر جھکا لیا۔

اُس کی آواز کی ملاوٹ اُسے توڑنے لگی تھی۔ ہمیشہ کی طرح۔۔۔ اور مہربانی اُسے پگھلانے لگی تھی۔۔۔

اُس کا دل چاہا تھا وہ اُس کے وجود میں چھپ جائے۔۔۔ ہمیشہ، ہمیشہ کے لئے۔

”بہت بدل گئی ہوتی۔۔۔۔۔ چار ساڑھے چار سال بعد دیکھ رہا ہوں تمہیں۔“

وہ پتہ نہیں کیا پڑھ رہا تھا اُس کے چہرے پر آنکھیں تو اُس نے جھکا لی تھیں۔

”ہاں بہت بدل گئی ہوں۔۔۔۔۔ کیونکہ زندگی بدل گئی ہے۔۔۔۔۔ تم سناؤ۔“ مومنہ نے ہنسنے کی

کوشش کی پھر ترک کر دی۔ اُسے یاد آیا تھا وہ اُس کا چہرہ پڑھ لیتا تھا اور اُس کے ماسک کے پیچھے بھی جو دکھتا تھا وہ بھی۔

”امریکہ سے آگیا ہوں میں۔۔۔۔۔ ڈگری مکمل ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ اب یہاں بابا کے ساتھ اُن

کی فیکٹری سنبھالنا شروع کی ہے۔۔۔۔۔ اور تم۔۔۔۔۔ آنٹی نے بتایا تم اکیٹنگ چھوڑ رہی ہو۔“ وہ اُس کی باتیں سنتے ہوئے آخری جملے پر چونکی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی۔ ایک ٹرے میں چائے کے کپ رکھے تھیا اندر آئی تھی۔

”ہاں بیٹا پہلے تو جہانگیر کی وجہ سے مجبوری تھی لیکن اب تو کوئی مجبوری نہیں ہے۔ اب اسے اپنے

گھر کا کریں گے اور کام ختم۔۔۔۔۔ تم چائے پیو۔“ تھیانے اُسے کچھ کہنے نہیں دیا تھا۔ فیصل کی بات کا جواب خود ہی دیا تھا اور ساتھ چائے کا کپ بھی اُس کے ہاتھ میں تھا دیا تھا۔ مومنہ اُلجھی نظروں سے ماں کا چہرہ دیکھتی رہی پتہ نہیں وہ کیا تھا جو وہ چھپانا چاہ رہی تھیں اور کیا تھا جو وہ اُسے جتا رہی تھیں۔ وہ پہلی بار اُن کے گھر آیا تھا مگر وہ غائبانہ طور پر اس گھر میں کئی سالوں سے موجود تھا اور مومنہ اور فیصل کے تعلق کی نوعیت بھی اس گھر کے سب لوگوں کو پتہ تھی۔ وہ چائے پیتے ہوئے فیصل کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ یوں تھیانے سے باتوں میں مشغول تھا جیسے ہمیشہ سے اُن سے ملتا رہا ہو۔ وہ اُسے جہانگیر کے قصے سن رہی تھی۔ اور وہ بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ مومنہ سلطان اُس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اُس سے وہ سوال کرنا چاہتی تھی جو کرنے کی ہمت نہیں تھی۔۔۔۔۔ اُس کی منگنی ہو چکی تھی اور وہ اُس سے اُس کی منگیتر کا حال پوچھنا چاہتی تھی۔

”میں اب چلتا ہوں کافی دیر ہو گئی۔“ فیصل نے یک دم اپنی رسٹ واپس دیکھتے ہوئے جیسے

چونک کر کہا تھا۔ ”بیٹا دوبارہ ضرور آنا۔“ تھیانے کھڑے ہوتے ہوئے اُس سے کہا۔ ”دوبارہ آؤں گا اور جلدی آؤں گا۔“ اُس نے تھیانے کے اصرار کا جواب مومنہ کو دیکھتے ہوئے دیا تھا۔ مومنہ مسکرا دی تھی۔ اُسے اب انتظار کرنے کی عادت نہیں رہی تھی اور وہ یہ عادت دوبارہ سیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ نہ انتظار، نہ خوش فہم امیدیں۔ نہ جھوٹے خواب۔ وہ ان میں سے کسی کا بوجھ اٹھانے میں اب دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔

”آپ نے اس سے یہ کیوں کہا کہ میں اکیٹنگ چھوڑ رہی ہوں۔“ فیصل کے گھر سے نکلتے ہی

اُس نے دروازہ بند کر کے تھیانے سے پوچھا تھا اُس کا جھوٹ جیسے اُس کے ذہن میں اٹکا ہوا تھا۔

”تمہارا دل تو کبھی بھی نہیں تھا اکیٹنگ میں، ہمیشہ تو کہتی تھی کہ نہیں کرنا چاہتی یہ کام۔۔۔۔ اور اب تو جہانگیر بھی نہیں ہے تو مجبوری بھی نہیں ہے۔“ ثریا نے ایسے عجیب سے انداز میں اپنے جھوٹ کی توجیہ دی تھی کہ وہ اُن کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔ ”اماں قرضہ ہے ہمارے سر پر۔۔۔ اور مجھے کوئی اور کام نہیں آتا۔“ اُس نے جیسے ماں کو یاد دلایا وہ اُس کے پیچھے چلتی ہوئی برآمدے میں آئی تھی اور ثریا کمرے میں داخل ہونے سے پہلے یک دم پلٹی تھی۔ ”شاید فیصل رشتہ لے آئے۔“ ثریا کے لہجے کی آس مومنہ کو کانچ کی طرح چبھی۔

”اماں۔۔۔“ وہ اُس آس کو توڑنے کے لئے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ثریا نے اُس سے پہلے ہی کہا۔ ”میں نے بات کی ہے اُس سے۔“ مومنہ دنگ رہ گئی۔ ”آپ نے کیا بات کی ہے اُس سے؟ وہ کیا سمجھ رہا ہوگا۔۔۔ اماں اُس کی منگنی ہو چکی ہے۔“ بہت سی کیفیات سے وہ بیک وقت گزری تھی۔ شرم، افسوس، خفگی اور اپنے دیر سے گھر پہنچنے کا پچھتاوا۔ وقت پر آتی تو ثریا کے فیصل کے ساتھ یہ سوال و جواب روک لیتی۔

”منگنی ٹوٹ گئی ہے اُس کی۔۔۔ لڑکی امریکہ سے پاکستان سیٹل ہونا نہیں چاہتی۔۔۔ اُس نے بتایا تھا مجھے۔۔۔ ماں کو تو تب بھی بھیجا تھا اُس نے۔۔۔ لیکن ہم خود غرض بن گئے تھے جہانگیر کی وجہ سے، ورنہ تم اپنے گھر کی ہوتی۔“ ثریا کو چند سال پہلے فیصل کی ماں کا گھر آنا یاد آیا تھا۔

”ہاں لایا تھا ماں کو۔۔۔ لیکن انہوں نے ہمارے خاندان کے بارے میں جان کر انکار کر دیا تھا۔۔۔ میرے اور اُس کے درمیان جہانگیر اور آپ کی خود غرضی نہیں آیا تھا، نصیب آیا تھا اماں۔“ مومنہ کو چھ سال پہلے فیصل کی ماں کا اُن کے گھر آنا یاد آیا تھا۔ تب وہ اسی محلے کے ایک دوسرے گھر میں رہتے تھے لیکن اس سے بہتر گھر میں اور تب فیصل صرف اپنی ماں کو دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا تھا اندر نہیں آیا تھا اور اُس کی ماں نے ایک گھنٹہ میں صرف مومنہ نہیں ثریا اور سلطان کے خاندان کی جڑیں تک کھنگال لی تھیں۔ وہ بہت اچھی، ملنسار، خوش گفتار اور خوش اخلاق خاتون تھیں مگر ”خاندانی“ تھیں اور خاندانی ہونے ہی کو اہمیت دیتی تھیں۔ وہ اچھی طرح سے اُن سے مل کر گئی تھیں اور اُن کے جانے کے بعد ثریا اور سلطان کو بیک وقت فکر لاحق ہوئی تھی کہ یہ رشتہ اگر ہو گیا تو پھر جہانگیر کے علاج کا کیا ہوگا اور انہوں نے مومنہ کو یہ بتا بھی دیا تھا کہ جہانگیر کو اس حالت میں چھوڑ کر وہ اگر اپنا گھر بسانے کا سوچے گی تو یہ خود غرضی ہوگی۔ مومنہ انہیں یہ نہیں کہہ سکی کہ پر پوزل بھیجنا فیصل کی خواہش تھی اُس کی نہیں۔ وہ اُسے جہانگیر یاد نہ بھی دلائے تو بھی وہ اُسے یاد تھا۔ وہ اُسے چھوڑ کر اپنی زندگی کا مر کے بھی نہیں سوچتی۔ مگر فیصل کی والدہ کے

اُس وزٹ نے جیسے سب کچھ خود ہی آسان کر دیا تھا۔ فیصل نے ہچکچاتے ہوئے اُسے اپنی ماں کے اعتراضات بتائے تھے اور مومنہ نے اُس کی بات کاٹ کر بڑی ہمت سے اُسے اپنے ماں باپ کا انکار سنا دیا تھا۔ محبت کا پردہ رکھنے سے زیادہ اُس پر پردہ ڈالنا ضروری تھا اور وہ اُس نے ڈال دیا تھا۔ دونوں اُس کے بعد کبھی نہیں ملے تھے۔ اور آج اتنے سالوں بعد ملے تھے تو ثریا جیسے اُس کہانی کو وہیں سے شروع کرنا چاہتی تھی اور مومنہ ماں کو بتانا چاہتی تھی کہ زندگی میں فلیش بیک آ بھی جائے تو کہانی وہیں سے شروع نہیں ہوتی جہاں فلم میں چھوڑی جاتی ہے۔۔۔۔۔ زندگی میں وقت ہوتا ہے جس کو کوئی ڈائریکٹر باندھ نہیں سکتا۔

”نصیب کا کیا ہے مومنہ۔۔۔۔۔ وہ تو بدلا جاسکتا ہے۔“ ثریا نے اُس سے آہ بھر کے کہا تھا۔ اُس نے فلم میں یہ لائن بولی ہوئی تو سینما میں Clap ملتی اُسے۔ مومنہ نے اعتراف کیا تھا دل میں۔

”میں نے بات کی ہے اُس سے۔۔۔۔۔ تم بھی بات کرو اُس سے۔“ ثریا نے اُس سے کہا تھا۔

”نہیں اماں میں بات نہیں کروں گی اُس سے۔ آپ کو بھی نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ وہ تجھ سے محبت کرتا ہے۔۔۔۔۔ محبت میں تو انا نہیں ہوتی۔“ ثریا نے اُس سے کہا تھا۔

”محبت میں انا نہیں ہوتی لیکن خود داری ہوتی ہے۔ میرے اور اُس کے درمیان سات سمندر ہیں۔ میں وہ سوئی ہوں جس کا گھڑا کچا نہیں ٹوٹا ہوا ہے۔ وہ وہ مہیوال ہے جو مجھے بچانے کے لئے خود کو نہیں ڈبوئے گا۔ ہمارا پیار بس اتنا ہی ہے۔۔۔۔۔ داستان کبھی نہیں بنے گا۔“ مومنہ سلطان نے ثریا سے کہا تھا اور پھر آنکھیں چراتی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ ثریا کے سامنے روتی تو وہ پھر جھوٹی آس دلاتی اور مومنہ سلطان کو اب پیار کی آس بھی نہیں رکھنی تھی بس اپنی زندگی کا کچھ کرنا تھا۔



تمہیں یقین ہے نا وہ مجھے لیڈ میں کاسٹ کرنے والا ہے؟“ مومنہ کے سٹوڈیو میں ہونے والی پریس کانفرنس میں شرکت سے چند منٹ پہلے اپنی گاڑی سے اتر کر سٹوڈیو کے ہال کی طرف جاتے ہوئے ضوفی نے نیہا سے پوچھا تھا۔ وہ جیسے کسی عجیب سے خدشے کا شکار ہو گیا تھا۔ ”100 فی صد یقین ہے۔“

نیہا نے اپنے ایوننگ گاؤن پر نمایاں ہونے والی ایک سلوٹ کو جیسے ہاتھ سے سیدھا کیا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے ہال کے دروازے تک آئے تھے جہاں کھڑے ایک ملازم نے بڑی مستعدی سے دروازہ کھولا تھا

ہال میں موجود تمام نشستیں تقریباً بھر چکی تھیں۔ میڈیا سے تعلق رکھنے والے لوگ اور اس ایونٹ کو کور کرنے والے میڈیا ٹیمز اپنے اپنے کیمرہ مینوں اور فوٹو گرافرز کے ساتھ اندر ٹولیوں میں کھڑی تھیں اور جرنلسٹس وہاں نظر آنے والے سٹارز سے گپ شپ میں مصروف تھے۔ وہ تقریباً 75-100 لوگوں کا

اجتماع تھا اور قلبِ مومن فی الحال وہاں موجود نہیں تھا۔ ہال کے ایک سرے پر ایک کم اونچائی کے سیٹج پر ایک لمبا کاؤنٹر اور اُس کے پیچھے دس بارہ کرسیاں تھیں جو اس وقت خالی تھیں اور اُس کاؤنٹر نما میز پر رکھے کچھ مائیکس کو چند technicians سیٹ کرنے میں مصروف تھے۔

نیہا بے حد انداز اور ادا سے ضوفی کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی اور اندر داخل ہوتے ہی ٹینا اور داؤد نے اُسے دیکھ لیا تھا جو بیک وقت اُن دونوں کی طرف لپکے تھے اور اُن کے اس انداز پر نیہا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی اور اُس نے جتانے والے انداز میں ضوفی کے کانوں میں سرگوشی کی۔ ”دیکھ لو۔۔۔“ ضوفی کا چہرہ بھی چمک اُٹھا تھا۔ وہ چند ہی لمحوں میں اس تقریب کا ”دولہا“ بننے والا تھا۔ اُس نے اپنے خون کو جیسے پارہ بنتے محسوس کیا تھا۔

”آپ لوگوں کی فرنٹ سیٹس ہیں۔۔۔ ہم انتظار کر رہے تھے آپ دونوں کا۔“ ٹینا نے پاس آتے ہی رسمی ہیلو ہائے کے بعد نیہا سے کہا تھا اور پھر وہ دونوں اُن دونوں کو ساتھ لیتے ہوئے فرنٹ سیٹ کی طرف جانے لگے تھے اور بالکل اُسی وقت نیہا نے ہال کے ایک کونے میں کھڑی صوفیہ دُرانی کو دیکھا اور اُسے جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ سگریٹ پیتے ہوئے ایک جرنلسٹ کے ساتھ گپ شپ کر رہی تھی۔ نیہا نے ہال میں نظر دوڑائی۔ اُسے قلبِ مومن نظر نہیں آیا۔ ”مومن کہاں ہے؟“ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اُس نے ٹینا سے پوچھا۔ ”وہ بس آنے والے ہیں۔ برانڈز کے کچھ لوگوں کے ساتھ اندر آفس میں ہیں۔“ ٹینا اور داؤد اُن دونوں کو بٹھا کر سیکنڈز میں غائب ہوئے تھے۔

”تمہارا موڈ کیوں آف ہو گیا ہے؟“ ضوفی نے نیہا کے چہرے کے بدلنے ہوئے تاثرات کو دیکھ لیا تھا۔ ”اُس نے صوفیہ دُرانی کو کیوں بلا رکھا ہے یہاں۔“ نیہا مدہم آواز میں کاٹ کھانے والے انداز میں بولی تھی۔ ضوفی نے چونک کر اس طرف دیکھا جہاں وہ دیکھ رہی تھی۔ وہ صوفیہ کے لئے اُس کی ناپسندیدگی سے واقف تھا۔ ”کر لیا ہوگا انوائیٹ دوسروں کے ساتھ!“ ضوفی نے کسی خاص تاثر کے بغیر کہا تھا۔ ”اس کو پتہ ہے مجھے زہر لگتی ہے وہ پھر بھی انوائیٹ کر لیا اُسے۔“ نیہا کی خفگی عروج پر تھی اور وہ اب متلاشی نظروں سے مومن کو ڈھونڈ رہی تھی اور ضوفی بار بار اُس کوٹ کوٹھیک کرنے میں مصروف تھا جسے پہن کر وہ آیا ہوا تھا۔ وہ نروس تھا ایکساٹیڈ ہونے کے ساتھ اور اُس کے انداز میں وہ نروس نیس جھلک رہی تھی۔ اُس کی توجہ اس وقت برابر بیٹھی نیہا کے گلے شکوے پر نہیں تھی۔

”بعد میں بُرا بھلا کہہ لینا یا اُسے۔۔۔ ابھی تو انجوائے کرو اس ایونٹ کو۔“ ضوفی نے اُس کے کان میں سرگوشی کی اور تبھی اُن دونوں نے ہال کے عقب میں یک دم سرگوشیوں کا ایک طوفان سا اُٹھتا

سُنا۔ قلبِ مومن اب اندر داخل ہو رہا تھا اور اُس کی آمد کے ساتھ ہی ہر طرف سے کیمروں کے flashes چمکنے لگی تھیں۔ وہ چلتا ہوا ہال کے اگلے حصے میں فرنٹ سیٹس کے سامنے سے گزرنے لگا اور گزرتے ہوئے اُس نے نیہا اور ضوفی کو دیکھا اور بالکل اُن کے سامنے آ کر مسکراتے ہوئے رُکا۔ وہ دونوں کھڑے ہو کر اُس سے ملے تھے۔ نیہا نے اُس سے گلے لگتے ہوئے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔

"Thank you & congratulations." مومن نے بھی جواباً سرگوشی کی۔

"Pleasure is always mine." اُس سے الگ ہوتے ہوئے وہ ضوفی سے ملا اور اُس سے کہا۔

"You are star of today's show." ضوفی کا چہرہ چمک اُٹھا اور کیمروں کے کچھ شٹر اُس پر فوکس ہوئے۔ مومن دونوں سے ہاتھ ملاتا اور پرنسپل پر چلا گیا تھا اور وہاں جا کر اُس نے اپنی سیٹ سنبھال لی اور اُس کے سیٹ سنبھالتے ہی سب نے اپنی سیٹس سنبھال لی تھیں۔

”آپ سب کا آج یہاں آنے کے لئے بہت شکریہ۔“ اُس نے مائیک سنبھالتے ہی کہنا شروع کیا۔ ”صنم میری چوتھی فلم ہے جسے میں اگلے دو مہینوں میں شوٹ پر لے جاؤں گا۔ اپنی پچھلی فلمز کی طرح اس بار بھی میں نے صرف ایک Change کیا ہے پچھلی فلم کی کاسٹ میں۔“ وہ کہتے ہوئے رُکا اور اُس نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی نیہا اور ضوفی کو دیکھا جن کے دلوں کی دھڑکن بے اختیار تیز ہوئی تھی۔ ضوفی نے اپنا کوٹ ایک آخری بار ٹھیک کیا۔ عقبی نشستوں میں سے کسی جرنلسٹ نے کہا تھا۔ ”ہمیشہ کی طرح ہیروئن بدلیں گے اس بار بھی۔“ مومن نے اُس جملے پر مسکرایا اور اُس نے کہا۔ ”نہیں وارڈروب ڈیزائنر۔۔۔ اس بار میری فلم کی وارڈروب صوفیہ ڈرانی کریں گی اور کاسٹ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ میں اب کاسٹ کو سٹیج پر بلا رہا ہوں۔“ نیہا اور ضوفی نے بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ وہ ویسے وہاں بیٹھے بیٹھے برف بنے تھے۔ وہ کمرہ اب تالیوں سے گونج رہا تھا اور سٹیج کے پیچھے سے باری باری فلم کی کاسٹ آ کر سٹیج پر رکھی کرسیوں پر بیٹھ رہی تھی۔ نیہا نے مومن کو دیکھا۔ وہ اُس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ یوں جیسے وہ اُس کے لئے کوئی وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔ وہ قلبِ مومن تھا معاف نہیں کرتا تھا۔۔۔ لیکن بھول جاتا تھا۔ وہ اُسے بھول گیا تھا۔



”تمہارا صاحب گھر پر ہے؟“ نیل بجنے پر شکور نے دروازہ کھولا تھا اور نیہا نے بڑی بدتمیزی

سے اُس سے پوچھا تھا۔ شکور کو اُس کے انداز پر جیسے دھچکہ لگا تھا۔

”مومن بھائی کا پوچھ رہی ہیں؟“ شکور کو ایک لمحہ کے لئے لگا وہ دادا کا پوچھ رہی تھی کیونکہ مومن

کو ”صاحب“ کہتے تو اُس نے نیہا کو کبھی نہیں سنا تھا۔ ”اور کس کا پوچھوں گی؟“ وہ کچھ اور بگڑی تھی۔

”جی جی وہ تو ہیں۔۔۔“ شکور نے بے ساختہ کہا اور دروازے سے ہٹ گیا۔ نیہا بجلی کی طرح

اندر گئی تھی۔ شکور کو بے اختیار گدگدی ہوئی۔ وہ اس گھر میں اسی چیز کو miss کرتا تھا جواب ہونے جا رہی تھی۔۔۔۔۔ لڑائی۔۔۔

مومن لاؤنج میں ٹہلتے ہوئے فون پر کسی سے ہنستے ہوئے بات کر رہا تھا۔ جب اُس نے نیہا کو

اس انداز میں اندر آتے دیکھا تھا۔

”میں تمہیں دس منٹ تک کال کرتا ہوں۔“ اُس نے فون پر اپنے مخاطب سے کہا اور پھر دوسری

طرف کی بات سننے کے بعد کہا۔ ”نہیں دس منٹ ہی لگیں گے۔۔۔ ایک مہمان ہے۔۔۔ دس منٹ میں

چلا جائے گا۔۔۔ اوکے بائے۔“ اُس نے فون پر کسی دوسرے سے بات کرتے ہوئے بھی نیہا کو جیسے اُس

کی اوقات جتائی تھی۔

”تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟“ اُس کے فون بند کرتے ہی وہ اُس پر دھاڑی تھی۔ وہ جواباً

tease کرنے والے انداز میں مسکرایا تھا۔ ”مومن۔“ ”کیا بگاڑ لیا تم نے مجھے فلم کے crew سے نکال

کر میرا۔۔۔ مجھے فرق نہیں پڑا۔“ اُس نے مومن کی مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”پھر تو

بہت اچھا ہے اس کا مطلب ہے ہماری دوستی اسی طرح قائم رہے گی۔“ مومن نے جیسے اُسے اور تپایا تھا۔

”تم ضوفی سے جلیس ہوئے ہو۔۔۔ تم سے برداشت نہیں ہوا کہ میں اُس کے اتنا قریب

ہوں۔ اُس کے لئے یہ سب کر رہی ہوں۔۔۔ تم بے حد mean اور insecure انسان ہو۔“ وہ اب

الزام تراشی پر اتر آئی تھی۔ ”کچھ اور؟“ مومن اُسی طرح برف بنا ہوا تھا۔ ”بڑا غور ہے نا تمہیں اپنے آپ

پر۔۔۔ میں تمہارے زوال میں تمہیں دیکھنے آؤں گی۔“ اُس نے تلخی سے کہا۔ مومن ہنسا۔ ”بڑے لمبے

انتظار کے بعد ملاقات ہوگی پھر تو۔“ ”میں کوشش کروں گی اتنا لمبا انتظار نہ کرنا پڑے۔“ نیہا نے اُسے پتہ

نہیں کیا جتایا تھا۔ اپنے ہاتھ کی انگلی سے اُس نے انگوٹھی نکالی اور اُسے پوری قوت سے اُس کے منہ پر دے

مارا۔ مومن بے اختیار پیچھے ہٹا تھا۔ انگوٹھی فرش کے ٹائلز پر گری۔ اُچھلی پھر گری اور پھر چکر کاٹنے لگی۔

مومن نے باہر جاتی ہوئی نیہا کو دیکھا جس کا وجود بھی اُس وقت اسی طرح بھنور بنا ہوا تھا مگر اُسے یہ اندازہ

نہیں تھا کہ وہ بھنور قلبِ مومن کے لئے گرداب بننے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔



”کہانی پہاڑوں پر رات کے ایک خوبصورت سین سے شروع ہوتی ہے۔ چاندنی رات ہے۔

درخت ٹھنڈی ہوا میں جھوم رہے ہیں اور۔“ مومن نے اختر کو سکرین پلے کی narration کے درمیان ٹوکا تھا۔ ”عباس نے چھ بجے آنے کو کہا تھا اور اب ساڑھے چھ ہو گئے ہیں۔“ مومن نے دیوار پر لگے وال کلاک پر نظر دوڑاتے ہوئے بلند آواز میں داؤد سے کہا تھا۔ اختر صاحب جو اس فلم کے رائٹر تھے اور اس وقت جب وہ سب لوگ ریڈنگ سیشن میں بیٹھے ہوئے تھے وہ ”سماں باندھنے“ کی کوشش میں مصروف تھے اور اُس کوشش کو مومن نے ضائع کر دیا تھا۔

”سگنل پر کہیں پھنسا ہوا ہے ٹریفک میں۔ میری کچھ دیر پہلے بات ہوئی ہے۔“ ٹینا نے جلدی سے بیچ میں مداخلت کرتے ہوئے کہا تھا۔

”ٹھیک ہے آپ کہانی سنانا شروع کریں۔ وہ آتا ہے تو اُس کو دوبارہ وہ حصہ سنا دیں گے جو اُس نے نہیں سنا۔“ مومن نے اختر صاحب کو اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”جی بہتر تو میں دوبارہ وہیں سے شروع کرتا ہوں۔“ اختر صاحب نے لمحہ بھی ضائع نہیں کیا تھا وہ 40-45 سال کی عمر کا ہونے کے باوجود اپنی گفتگو اور رک رکھاؤ سے ہمیشہ اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی بڑی عمر کا ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

”ہیروئن چاندنی رات میں ایک پہاڑ پر رقص کر رہی ہے۔۔۔ سفید گاؤں میں پریوں کی طرح۔۔۔ آسمان پر چاند ستارے ہیں اُس پہاڑ پر پھیلا سبزہ چاند کی روشنی میں مخمل کی طرح چمک رہا ہے اور اُس مخمل پر ہیروئن کے خوبصورت دودھیارنگت کے سبز پاؤں تھرک رہے ہیں۔“ اختر منظر کشی کرنے کی کوشش میں جیسے ایک ایک لفظ کی عکاسی اپنے ہاتھوں اور جسم کی حرکات سے کر رہے تھے اور انتہائی مضحکہ خیز نظر آ رہے تھے اور ہر جملے کے بعد وہ داد و تحسین کے لئے مومن کی طرف دیکھتے تھے جس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ خاموشی سے کہانی سن رہا تھا۔

”اف کیا اوپننگ ہے اختر۔۔۔ تباہی سین ہے۔۔۔ میں تو ابھی سے وہ گاؤں، رقص، رات اور اپنے پیروں کی moments کو visualize کر رہی ہوں۔“ قلب مومن سے کچھ فاصلے پر بیٹھی شبیلی نے جیسے کچھ بے اختیار ہو کر اختر کو داد دی تھی اور اختر کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ اپنے گلاسز ٹھیک کرتے ہوئے اُس نے ایک بار پھر مومن کو دیکھا اُس کی طرف سے کسی ستائشی جملہ کے انتظار میں وہ اب بھی ویسے ہی سنجیدہ بیٹھا ہوا تھا۔ شبیلی کی داد پر بھی اُس نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

”یہاں ہمارا ٹائٹل سونگ آ رہا ہوگا اور ساتھ کریڈٹس چل رہے ہوں گے۔۔۔ ہیروئن کے قدموں کی ہر حرکت پر اور ہر beat پر۔“ اختر پھر اپنے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”میوزک کون کر رہا ہے اس بار؟“ شیلی کو یک دم پوچھنے کا خیال آیا۔ ”شجاع حیدر سے ہی کروا

رہے ہیں۔“ مومن نے اُسے جواب دیا اور پھر ساتھ ہی اختر سے پوچھا۔ ”تو یہ ہے ہمارا Opening sequence؟“ اختر نے بڑے خوشی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”جی مومن صاحب۔“ ”بکواس ہے۔“ دلفظوں میں مومن نے جیسے اختر صاحب کے مہینوں کی محنت پر پانی پھیرا۔ ”ہیں؟“ اختر کو جیسے یقین نہیں آیا۔ اُس نے اپنی گلاسز کو ایک بار پھر ٹھیک کیا اور اپنے رائٹنگ پیڈ پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا؟“

”Exactly۔۔۔ میرا بھی یہی پوائنٹ تھا کوئی نیا پن ہی نہیں ہے۔“ شیلی نے گرگٹ بننے میں لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔ اختر صاحب کا درد کچھ اور بڑھا۔

”مجھے کہانی کو شہر میں کھولنا ہے۔۔۔ یہ پہاڑوں میں کہاں لے گئے آپ ہیروئن کو؟“ مومن نے اختر سے کہا اور شیلی نے لقمہ دیا۔

”That's the point۔۔۔۔ شہر تو relevant ہے پہاڑ تو relevant ہی نہیں اور پھر چاندنی رات گاؤن، ڈانس۔۔۔۔ so cliched۔“ شیلی کے جملوں نے اختر صاحب کی حالت کچھ اور غیری کی۔

”ڈانس رہے ہیروئن تو میں نے بالکل فیری ٹیل والے انداز میں اوپننگ دی ہے۔“ مومن نے اختر صاحب کی بات کاٹی۔ ”اور مجھے فیری ٹیلز سے نفرت ہے۔“ بالکل اختر صاحب فیری ٹیلز میں کہاں چلے گئے آپ۔۔۔۔ Youth کو دکھانی ہے فلم۔۔۔ بچوں کو تھوڑی دکھانی ہے۔“ شیلی مومن کے ہر جملے کی تائید عادتاً کر رہی تھی۔ فلم انڈسٹری میں ڈائریکٹر ہمیشہ ”صحیح“ ہوتا ہے اور رائٹر ہمیشہ کم عقل۔

”کلب میں کھولیں سین کو۔۔۔۔ روشنی ڈانس فلور پر دو لڑکوں کے ساتھ ڈانس کر رہی ہے اور اُس میں سے ایک لڑکا اُسے گلے لگانے کی کوشش کرتا ہے تو دوسرا لڑکا پہلے کو تھپڑ مارتا ہے۔“ مومن نے چند سیکنڈز میں اوپننگ sequence اُن کے سامنے رکھ دیا تھا۔

”Brilliant۔۔۔۔ Fantastic۔۔۔۔ یہ ہوتی ہے اوپننگ اختر صاحب۔۔۔۔ تو مومن

روشنی تو ڈانس کرتی رہے گی نا؟“ شیلی نے ایک ہی سانس میں مومن کو داد دی اور پھر پوچھا۔

”ہاں۔۔۔۔ پہلا لڑکا دوسرے کو جواباً مکارے گا اور پھر یکدم پٹل نکال لے گا۔“ مومن

نے اپنی بات جاری رکھی۔ شیلی نے اُسے ایک بار پھر ٹوکا۔ ”اور دوسرے کو گولی مار دے گا؟“ وہ اب داد طلب نظروں سے مومن کو دیکھ رہی تھی۔ ”نہیں روشنی کو گولی مار دے گا۔“ مومن نے اُسی انداز میں کہا۔

شیلی بھونچکا رہ گئی۔ وہ اوپننگ سین میں ہی ہیروئن کو گولی مروا رہا تھا اور بد قسمتی کی بات یہ تھی کہ ہیروئن وہ

”Lights out---کلب میں ہنگامہ---credits چلنا شروع---ٹائٹل سونگ۔“

مومن نے ایک ہی جملے میں اوپننگ sequence بنایا۔ شیلی اب تک خود کو سنبھال چکی تھی۔

”Super impressive---کمال کر دیا۔۔۔ پہلے ہی سین میں ایکشن، ایڈونچر،

تھرل۔۔۔۔ مومن کی signature opening“ شیلی نے جھوم جھوم کر اُس کو داد دی۔ مومن اب اُسے سن بھی نہیں رہا تھا۔ وہ ہیر و نر اور ایکٹرز کی اس طرح کی لفاظی اور خوشامد کو پہچانتا تھا اور اُن سے بہت کم متاثر ہوتا تھا۔

”سمجھ آگئی مجھے۔“ اختر نے کچھ بجھے بجھے انداز میں کہا۔ ”روشنی کوئی ایسرا ٹائپ کی ڈانسر نہیں

ہے اختر۔۔۔۔ کلب میں ماڈرن ہپ ہاپ ڈانس کرنے والی لڑکی ہے تو دیوی مت بنائیں اُسے۔۔۔۔

ڈانس کرواتے ہوئے اُس کے ہر سین میں مجھے thrill چاہیے۔۔۔۔ کلب ڈانسر والی thrill۔۔۔۔ وہ

جب جب سکریں پر آئے سکریں کو آگ لگا دے۔۔۔۔ سیٹیاں بجوادے۔۔۔۔“ مومن روشنی کا کردار اور

رول وضاحت سے پیش کر رہا تھا اور اختر رائٹنگ پیڈ پر نوٹس لینے میں مصروف تھا۔

”اب سمجھ گیا سر۔۔۔۔ میرے ذہن میں اپنی انڈسٹری کی پرانی ہیر و نر کی طرح کا image تھا

روشنی کا۔۔۔۔ بالکل حسن جہاں کی طرح کا کردار بنانا چاہتا تھا میں۔۔۔۔ مگر اب بدلتا ہوں اُسے۔“ روانی

سے بات کرتے ہوئے اختر کے اُس ایک جملے میں لئے جانے والے نام پر قلب مومن جیسے کرنٹ کھا کر

سیدھا ہوا تھا۔

”کون حسن جہاں؟“ شیلی پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہاں کوئی بھی اس وقت قلب مومن کی

طرف متوجہ نہیں تھا ورنہ اُس کے چہرے کا پھیکا پڑتا رنگ اُن سب کی نظروں میں آ جاتا۔

”پاکستان فلم انڈسٹری کی سب سے بڑی ڈانسر ہیر و نر۔“ اختر نے اُسی روانی میں جواب دیا۔

”میں نے کبھی نام نہیں سنا۔“ شیلی نے کچھ سوچ کر کہا۔ اس سے پہلے کہ اختر کچھ کہتا۔ قلب مومن یک دم

صوفہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے تقریباً چلاتے ہوئے اختر سے کہا۔ ”حسن جہاں نہیں دکھانی مجھے اپنی فلم

اور اس رول میں!! سمجھے؟“ کمرے میں یک دم خاموشی چھائی تھی۔ مومن نے میز پر پڑا سگریٹ لائٹر اور

سگریٹ کی ڈبیا اُٹھائی اور وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ اُس کے وہاں سے جاتے ہی سب سے پہلے جیسے شیلی

کے حواس بحال ہوئے تھے۔ آواز کو حتی المقدور ہلکی رکھتے ہوئے اُس نے ٹیٹا اور داؤد سے کہا۔ ”اسے کیا

ہوا ہے؟“

”میرا خیال ہے عباس نہیں پہنچا ابھی تک تو اُسی کی وجہ سے اپ سیٹ ہو رہے ہیں۔“ ٹینا نے جیسے صورت حال سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

اندر ہاتھ روم میں قلبِ مومن اب لائٹس سے سگریٹ جلا رہا تھا اور سگریٹ جلاتے ہوئے اُس نے اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ دیکھی۔ وہ غصہ کے اثرات تھے جواب بھی اُس کے وجود کے اندر کسی جوار بھاٹا کی طرح گزر رہا تھا۔ سنک کا پانی کھولے اُس کے شور میں اپنے اندر کے شور کو دبانے کی کوشش میں بے حال وہ اب بھی اندر کمرے میں ہونے والی گفتگو سن پار رہا تھا۔

”اختر صاحب یہ حسنِ جہاں ہے کون؟ ذرا دکھائیں تو مجھے۔“ اُس نے شیلی کو کہتے سنا اور مومن کا غصہ بڑھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا اُن میں سے کوئی بھی حسنِ جہاں کا نام لیتا۔ کوئی بھی حسنِ جہاں کو دیکھتا۔

”داؤد ذرا google پر search کر کے دکھاؤ اُنہیں۔۔۔ Diva تھی وہ Diva۔۔۔“

پاکستان فلم انڈسٹری پر حکومت کرنے والی Diva۔۔۔۔۔“ اُس نے اختر کو کہتے سنا۔

مومن نے ہونٹوں میں پھنسے سگریٹ کو انگلیوں سے پکڑ کر اضطراب کے عالم میں تین چار گہرے گہرے کش لئے۔ دھواں اندر گیا مگر غم باہر نہیں نکلا۔ نہ ہی غصہ۔۔۔ دونوں اندر کہیں چھپ کر بیٹھ گئے تھے یوں جیسے اُس کے سامنے آنے سے ڈرتے ہوں۔

"Oh my God what a beauty." اُس نے شیلی کی حیرت زدہ تحسین آمیز آواز سنی۔

”کہاں ہوتی ہیں یہ آج کل؟“ وہ یقیناً داؤد یا ٹینا کے laptop کی سکرین پر حسنِ جہاں کو دیکھ رہی تھی اور پوچھ رہی تھی اور مومن جل رہا تھا ہاتھ میں پکڑے سگریٹ کی طرح۔۔۔۔۔ وہ حسنِ جہاں کو اُن کی آنکھوں سے دور کر دینا چاہتا تھا۔

”ان کے ساتھ ٹریجڈی ہوگئی تھی ایک بہت بڑی۔“ اُس نے اختر کو ایک آہ بھر کے کہتے سنا۔

قلبِ مومن کی کنپٹیاں اب تھر تھرانے لگی تھیں۔ اُس کی ساری نسین جیسے اُس کے وجود سے باہر آنا چاہ رہی تھیں۔ سگریٹ اب انگلیوں کی پوروں کو جلا رہا تھا۔

”کیا ٹریجڈی؟“ شیلی نے کہا تھا اور قلبِ مومن دھڑاک سے ہاتھ روم کا دروازہ کھول کر واپس کمرے میں آیا تھا۔

”یہ عباس ابھی تک نہیں آیا۔۔۔۔۔ یہ پروفیشنلزم ہے اس کا۔۔۔ ایک فلم ہٹ ہوگئی تو خود کو سٹار سمجھ بیٹھا ہے۔“ وہ باہر آتے ہی دھاڑا تھا اور وہاں داؤد کے لیپ ٹاپ کے گرد اکٹھے ہوئے لوگوں کو ایک بار پھر سانپ سونگھ گیا تھا۔

”باس میں ابھی فون کرتا ہوں اُسے۔“ داؤد نے گھبرا کر فون نکالتے ہوئے کہا تھا۔ باقی بھیڑ بھی بوکھلائے انداز میں چھٹی تھی۔

”اب وہ آئے تو بیٹھا رہے۔۔۔۔ میں اس کے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔۔۔۔۔ جارہا ہوں میں۔“ مومن رُ کے بغیر اپنی میز سے اپنا لیپ ٹاپ اور فون اٹھاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تھا اُن سب کو اسی ہکا بکا انداز میں چھوڑ کر۔



”کھانا لگاؤں؟“ شکور نے مومن کو دیکھتے ہی کہا تھا۔ ”نہیں۔“ وہ بغیر رُ کے اندر آیا تھا۔ ”کچھ اور چاہیے؟“ شکور اُس کے پیچھے لاؤنج میں آیا۔ ”کچھ نہیں چاہیے۔“ اُس نے اُس روکھے انداز میں اُس سے کہا تھا۔ وہ اُس وقت صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے غائب ہو جائے اور شکور کو غائب ہونے کا موقع مل گیا تھا۔

قلب مومن اُس کے جانے کے انتظار میں بیٹھا رہا اور پھر جب وہ چلا گیا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

سٹور روم کی لائٹ آن کرتے ہوئے بھی وہ جانتا تھا وہاں اُسے کس چیز کی تلاش تھی۔ سٹور روم میں دیواروں کے ساتھ ہر سال دادا کی اُسے تحفے میں دی ہوئی خطاطی اُسی طرح پیکڈ ایک کے ساتھ ایک ٹکی پڑی ہوئی تھیں۔ وہ چند لمحے وہاں پڑے سامان کو دیکھتا رہا پھر اُس نے وہاں پڑی ایک درازوں والی میز کا سب سے اوپر والا دراز کھولا تھا اور اُس میں سے وہ فائل نکالی تھی جو سب سے اوپر پڑی ہوئی تھی۔

واپس لاؤنج کے صوفہ پر بیٹھ کر اُس نے اُس فائل کو سامنے میز پر رکھ لیا تھا۔ فائل کا کور کھولنے سے بھی پہلے اُسے پتہ تھا وہ کیا دیکھنے جا رہا تھا۔ وہ رنگین اردو اخبار کا تراشہ جس میں حسن جہاں کی موت پر ایک فیچر تھا اور اُس فیچر کی ہیڈ لائن تھی۔

”قتل یا خودکشی؟ حسن جہاں کی موت کا معمہ آج تک حل نہیں ہو سکا۔ یا پھر حسن جہاں آج بھی زندہ ہے اور زندہ ہے تو کہاں ہے؟“

مومن ایک بار پھر اُس اخباری تراشے کو لے کر بیٹھا رہا تھا۔ اُس فائل میں وہ کئی سالوں سے حسن جہاں کے بارے میں ملنے والی ہر خبر اکٹھی کر رہا تھا اور کس لئے کر رہا تھا وہ یہ نہیں جانتا تھا۔ پر ہر دفعہ درد سے بے حال ہونے پر کسی کسی رات کو وہ ان سب اخباری تراشوں کو اپنے سامنے بچھا کر بیٹھ جاتا تھا یوں جیسے اُن خبروں کی بھول بھلیوں میں وہ کوئی راستہ کوئی پتہ ڈھونڈ رہا تھا۔ نہ راستہ نظر آ رہا تھا۔ نہ کوئی



”نہیں پر نکالنے کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے ایسے کیسے نکال سکتے ہیں وہ؟ کام سے مطمئن نہیں تو دس بار لکھ کر دینے کو تیار ہوں میں۔“ اختر صاحب کے طوطے کبوتر سب اڑ چکے تھے اور وہ داؤد کے سامنے بیٹھے بے حد بے چارگی میں وضاحتیں کرتے اور مانگتے جا رہے تھے۔ داؤد نے انہیں کچھ دیر پہلے فلم کے سکرپٹ سے علیحدگی کا بتایا تھا۔ اور اب بیٹنا اور داؤد دونوں کو ان پر ترس آ رہا تھا کیونکہ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ اختر کو قلب مومن کے اس فیصلے کی کیا تو جیہہ پیش کرتے۔

”اختر بھائی مومن بھائی سے ملاقات کروانا ہوں میں آپ کی وہ ترکی سے واپس آتے ہیں تو۔۔۔ ابھی تو ہم دونوں بھی کل ترکی جا رہے ہیں۔“ داؤد کی بات پر اختر کے غم میں جیسے اور اضافہ ہوا۔

ترکی تو اُس نے بھی جانا تھا ساتھ رکبی کرنے کے لئے۔

”آپ قسم کھا کر کہیں کسی اور رائٹر کو نہیں لے جا رہے ساتھ۔“ اختر نے روکھے انداز میں کہا اور داؤد نے لمحہ برابر بھی انتظار کئے بغیر قسم کھائی۔ اختر صاحب کو جیسے کچھ قرار آیا تھا۔ وہ بمشکل آفس سے گئے تھے اور ان کے رخصت ہوتے ہی بیٹنا نے داؤد سے کہا۔ ”کیوں ہٹایا اُن کو فلم سے؟ آخر ہوا کیا ہے۔۔۔؟ اختلافات تو پہلے بھی ہوتے رہتے ہیں سکرپٹ وغیرہ پر۔۔۔ پھر اس بار مومن کو کیا ہوا؟“ وہ ایک کے بعد ایک سوال کر رہی تھی۔ ”مجھے صرف ایک چیز پریشان کر رہی ہے۔ اس بار فلم لکھے گا کون؟“ داؤد نے اپنی پریشانی بتائی تھی۔



”مجھے بھی لے جائیں ساتھ۔۔۔ ترکی ہی گھوم آتا۔“ شکور کی حسرت اپنے عروج پر تھی۔ وہ مومن کا بیگ پیک کر رہا تھا اور مومن وارڈروب سے اپنے کپڑے نکال نکال کر اُسے دے رہا تھا۔

”تمہیں تو کہا تھا میں نے مستقل چلے جاؤ دادا کے پاس۔۔۔ انہیں بھی سہولت ہو جائے گی۔ تمہارا بھی شوق پورا ہو جائے گا۔“ مومن نے ایک بلیز ریٹنگر سے اُتارتے ہوئے بیڈ پر رکھا۔

”مستقل جانے کو تو نہیں کہا میں نے۔۔۔ آپ کے پاس تو دل لگا رہتا ہے میرا۔۔۔ دادا جی کے پاس دل کہاں لگتا ہے میرا۔۔۔ وہاں نہ پارٹیاں نہ لڑکیاں، نہ چغلیاں۔“ اُس نے ٹھنڈی آہ بھر کے کہا پھر مومن کو اپنے آپ کو گھورتے دیکھ کر جلدی سے بولا۔ ”سامان پیک کر دیا وزن کر لوں ذرا۔“ وہ اُس کا بیگ گھسیٹتے ہوئے باہر لے گیا۔ مومن نے وارڈروب بند کی ہی تھی کہ اُس کا سیل فون بجنے لگا وہ ایک

”اوہ ہائے مومن تم مل گئے ورنہ بیٹنا تو کہہ رہی تھی تم ترکی کے لئے نکل رہے ہو فلم کی ریکی کے لئے آج رات۔“ کال ریسیو کرتے ہی صدف نے تیزی سے کہا۔ ”ہاں بس دو گھنٹے کے بعد نکل جاؤں گا۔“

”بس پھر زیادہ وقت نہیں لوں گی تمہارا۔ comments دے دو اپنے۔“ اُس جرنلسٹ نے جلدی سے کہا۔

”کس چیز پر؟“ وہ اُلجھا۔
 ”نیہا نے ضوفی کے ساتھ اپنی منگنی اناؤنس کی ہے۔۔۔ پکچر زشیر کی ہیں فیس بک پر کچھ دیر پہلے تو بس اسی کے بارے میں۔“

"Best of luck to them, they deserved each other."

ایک لمحہ کے تامل کے بغیر مومن نے کہا تھا۔

”یہی لکھ دوں؟“ جرنلسٹ نے گریدا۔ ”ہاں۔“

”تمہارے ساتھ بھی تو کوئی چکر تھا نیہا کا۔ اُس کا کیا ہوا؟“ جرنلسٹ بالا آخر اُس سوال پر آگئی جس کے لئے وہ کال کر رہی تھی۔ ”وہ بس چکر ہی تھا اور میں اب چکروں سے الرجک ہو گیا ہوں۔“ اُس نے بے ساختگی سے کہا تھا۔ جرنلسٹ ہنسی۔

"Ok have safe flight." اُس نے فون بند کر دیا۔ مومن چند لمحے بند فون کو دیکھتا رہا، وہ اگر محبت تھی تو اُسے کچھ ہوا کیوں نہیں تھا، دُکھ نہ ہوتا غصہ ہی آتا۔ لیکن اس سرد مہری کی کیفیت کو وہ بوجھ نہیں پایا تھا۔ قلب مومن کو اپنے دل سے خوف آیا تھا اُس لمحہ وہ واقعی بڑا ظالم تھا کسی کو نکالتا تھا تو ٹھوکر مار کر ہی نکال دیتا تھا۔

☆.....☆.....☆

”کب جا رہی ہو امریکہ؟“ اقصیٰ نے کھانا کھاتے ہوئے اُس سے پوچھا تھا۔ مومنہ ایک ہفتہ لاہور میں فلم کی شوٹنگ کا پہلا سہیل کروا کر ایک دن ہی پہلے واپس آئی تھی۔ اور اب دونوں اُس ریسٹورنٹ میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔

”چھتہ تاریخ کو۔“ مومنہ نے کھانا کھاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی اُسے یاد دلایا۔ ”بل میں دوگی آج۔“ اقصیٰ بے اختیار مسکرائی۔ ”میرے پاس تھے بھی نہیں پیسے۔۔۔ تم ویسے بھی اب ہالی ووڈ سٹار ہو

تمہیں ہی دینے چاہیے۔“

اُس نے مومنہ کو چھیڑا تھا۔ وہ مسکرا دی۔ ”چند سیز ہیں میرے فلم میں۔۔۔ وہ کسی کو یاد بھی نہیں رہنے، ہاں مگر فلم کی fees سے میرا بہت سا قرضہ اُتر جائے گا۔“ اُس نے کھانا کھاتے ہوئے اقصیٰ سے کہا تھا۔ اقصیٰ نے تبصرہ نہیں کیا۔

”فیصل کی کوئی خبر؟“ اُس نے یک دم پوچھا۔ مومنہ حیران رہ گئی۔ ”فیصل کہاں سے یاد آ گیا

تمہیں؟“

”بس آ گیا یاد..... دوبارہ نہیں آیا؟..... کوئی فون..... کوئی بات چیت..... آنٹی نے بتایا تھا اُس کی منگنی ختم ہو گئی۔“ مومنہ نے اُس کی زبان کی چلتی ہوئی ٹرین کو روکا۔ ”نہیں دوبارہ نہیں آیا..... کوئی فون نہیں..... کوئی بات نہیں..... ایک منگنی ٹوٹی ہے پھر ہو جائے گی۔“ اقصیٰ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”شاید تمہارے ساتھ.....“ مومنہ نے اُسے دیکھا پھر مسکرائی۔ ”مجھے معجزوں پر یقین نہیں رہا اور پیار میں تو بالکل بھی نہیں۔“ ”حالانکہ معجزے صرف پیار ہی میں ہوتے ہیں۔“ اُس نے اقصیٰ کو کہتے سنا تھا۔ ”جہانگیر کی قبر پر جاؤں گی آج..... اتنے دن سے موقع ہی نہیں ملا آگے بھی مصروف ہوں۔“ اُس نے بات بدل دی تھی جیسے اقصیٰ کو بتایا تھا کہ اُسے اس موضوع پر بات نہیں کرنی۔

☆.....☆.....☆

اُس نے سوندھی ہوا میں گہرا سانس لیتے ہوئے جیسے اُس ہوا کو اپنے اندر اتارنے کی کوشش کی۔۔۔ وہاں کچھ دیر پہلے جیسے بارش ہوئی تھی جواب تھم گئی تھی لیکن راستے کی مٹی نم تھی اور اُس پر پڑے پتے بھی اور لکڑی کا وہ کاٹج بھی جس کی طرف وہ جا رہا تھا۔

اُس خالی راستے پر وہ اپنا ٹرائی بیگ کھینچتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اپنی جیکٹ بازو پر ڈالے جیسے اپنے ماضی کو یاد کر رہا تھا۔ وہاں گزارے ہوئے کئی سال۔

وہ اس بار وہاں لمبے عرصہ کے بعد آیا تھا۔ لکڑی کے اُس کاٹج کے سامنے جا کر وہ رُکا تھا جو اس ڈھلوانی راستہ کے ایک کونے میں ہمیشہ کی طرح خاموش اور اکیلا کھڑا تھا۔ بارش کے قطرے اب بھی کاٹج کی چھٹوں کے کونوں سے پھسلتے نیچے ٹپک رہے تھے۔ اپنا بیگ اٹھائے وہ برآمدے کی لکڑی کی سیڑھیوں پر چڑھا تھا جو اُس کے قدموں کے بوجھ کے نیچے چڑمائی تھیں۔ بالکل سامنے لکڑی کے دروازے پر لوہے کا وہ کندہ اب بھی ویسے ہی موجود تھا جسے بجانے پر دروازہ کھلتا تھا مگر قلبِ مومن جانتا تھا وہ دروازہ ویسے ہی کھلا ہوا تھا۔ عبدالعلی کو عادت نہیں تھی دروازہ بند کرنے کی۔ دروازے پر ہاتھ رکھے وہ دروازے کو دھکیلتے

دھکیلتے رُکا۔ پھر دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر اپنا بیگ لے کر آگیا۔ اندر سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا شاید کئی دہائیوں سے تھا۔ Calligraphies سے بھرے ہوئے در و دیوار، جگہ جگہ پڑے ہوئے چھوٹے بڑے ایزل۔ وہ شاید وہ کمرہ تھا جہاں پر عبدالعلی اپنے پاس آنے والے نوجوان طلبہ کو Calligraphy سکھاتے تھے۔ محقق سائل آف کیلی گرافی اور وہیں ایک دیوار پر لگی بہت ساری calligraphies اُس نے پہچانی تھیں وہ اُس کے ہاتھ کی بنی ہوئی تھیں۔ اُس کے بچپن کی ناپختہ خطاطی کے نمونے اور پھر نوجوانی کی پختہ لکریں۔۔۔ قلبِ مومن نے بے اختیار اُس دیوار سے نظریں چرائیں۔ وہ دیوار ہمیشہ اسی طرح اُسے اپنی طرف کھینچتی تھی اور وہ اسی طرح اپنے آپ کو اُس سے دور کرتا تھا۔

کمروں میں ہوتا ہوا دبے قدموں وہ گھر کے عقبی حصہ میں آگیا تھا۔ وہاں لان میں اُس نے عبدالعلی کو کیا ریوں سے جڑی بوٹیاں نکالتے دیکھا۔ وہ بچوں کے بل بیٹھے کام کر رہے تھے اور وہ برآمدہ جہاں مومن کھڑا تھا اُس طرف اُن کی پشت تھی۔ مومن اسی بے آواز طریقے سے چلتے ہوئے اُن کے عقب میں آیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اُس نے عبدالعلی کو کہتے سنا۔ ”سوچا تمہارے آنے سے پہلے یہ کام بھی پنڈالوں ورنہ تم کہو گے مجھے تمہارے لئے وقت نہیں ملتا۔“ وہ کہتے ہوئے کھڑے ہو کر پلٹے تھے اور مومن ہنس پڑا تھا۔ عبدالعلی کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اُس نے کہا۔ ”آپ کو ہر بار میرے آنے کا پتہ کیسے چل جاتا ہے؟“ اُن نے گلے لگتے ہوئے اُس نے پوچھا۔ ”تمہاری خوشبو سے۔“ اُسے ساتھ لگاتے اُسے چومتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔ ”یہ پرفیوم کی خوشبو ہے دادا۔“ اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تمہارے وجود کی بھی ہے..... خیریت سے پہنچ گئے؟“ عبدالعلی کہتے ہوئے اُس سے الگ ہوئے۔ ”ہاں پہنچ گیا، ٹیم تو کل استنبول پہنچے گی..... میں نے سوچا میں ایک دو دن آپ کے ساتھ گزار آؤں..... بہت عرصہ ہو گیا یہاں آئے۔“ مومن نے اُن کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ وہ اب اندر برآمدے کی طرف جا رہے تھے۔

”سامان رکھ لو پھر کھانا کھاتے ہیں۔ بھوک لگی ہوگی تمہیں۔“ انہوں نے اندرونی کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو انتظار تھا میرا؟“ مومن گریڈے بغیر نہیں رہ سکا۔ ”وہ تو ہمیشہ ہی رہتا ہے۔“ وہ مسکرائے اور اندر چلے گئے وہ اُن کے پیچھے گیا۔ وہ اُس کا کمرہ تھا اب بھی ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ ایک دیوار پر اُس کے باپ کی ایک بہت بڑی تصویر جس میں وہ Whirling Darvesh کے سفید لباس میں رقص کی حالت میں بازو پھیلائے ہوئے تھا اور وجہ میں نظر آ رہا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر اُس کی اور طحہ کی اور بھی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ چھوٹے بڑے پرانے فریزر میں۔

”بالکل تمہارا چہرہ ہے۔“ عبدالعلی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے طحہ کی تصویر دیکھتے

ہوئے کہا تھا ایک ہلکی بڑ بڑاہٹ میں پھر پلٹ کر مومن سے کہا۔ ”ہے نا؟“ وہ اُن کی بات کا جواب دینے کی بجائے دیوار پر اُس تصویر کے برابر کھڑا ہو گیا اور اُس نے کہا۔ ”آپ بتائیں۔“ عبدالعلی آگے بڑھے اور اُس کا چہرہ اپنی نرم انگلیوں سے ٹٹولتے ہوئے بڑبڑانے لگے۔ ”ہاں سب کچھ ویسا ہی ہے۔“ ”سب کچھ کیا؟“ ”مومن نے گریڈا۔“ ”آنکھیں، ناک، ہونٹ اور ضد۔“ وہ اُن کی بات پر بے اختیار ہنسا۔ ”اچھا اُن میں بھی تھی ضد؟“ اُس نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔ عبدالعلی مسکراتے ہوئے زمین پر پڑا اُس کا بیگ اٹھا کر باتھ روم کے دروازے کے پاس پڑی ایک میز پر رکھتے ہوئے بولے۔ ”مجھ میں بھی تھی ضد۔“

”آپ میں..... میں نہیں مانتا دادا۔“ مومن نے بے اختیار کہا۔ وہ اب کمرے کے پتھوں بیچ کھڑا اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ عبدالعلی نے اُسے دیکھا اُنہیں اُس پر طحہ کا شبابہ ہوا۔ انہوں نے نظریں چرائیں۔ ”تمہارا باپ بھی بڑے سوال کیا کرتا تھا مجھ سے۔“ پتہ نہیں کیا یاد آیا تھا عبدالعلی کو۔ ”اچھا کیا پوچھتے تھے؟“ ”مومن نے دلچسپی سے پوچھا۔ ”وہی سوال کرتا تھا جو تمہارے تھے۔“ عبدالعلی نے مسکرا کر اُس سے کہا تھا۔

”آپ اُنہیں ڈانس سے منع کرتے ہوں گے یہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ whirling

Darvesh بنیں اور وہ ضد کرتے ہوں گے۔“ مومن نے خود ہی اندازہ لگایا۔

”نہیں اس رقص سے تو منع کیا ہی نہیں تھا میں نے اُسے۔ وہ کیلی گرافی کرتا تھا ہاتھ سے رنگ بکھیرتا تھا کیونوس پر تو بھی اللہ کا نام لکھتا تھا رقص کرتا تھا تو بھی عشق الہی میں..... اس سے کیا روکتا میں..... کیوں روکتا میں.....؟ روکا تو بس کسی اور چیز سے تھا میں نے۔“ اُن کی آنکھوں اور آواز میں اُداسی اکٹھی جھلکی تھی۔ ”کس چیز سے؟“ ”مومن سوال کئے بغیر نہیں رہ سکا۔“ ”تم معاف نہیں کرو گے مجھے مومن..... نہ سوال کرو یہ۔“ اُس نے جیسے عبدالعلی کا کوئی کھرڈ گریڈا تھا۔ ”وہاں رات کو کیلی گرافی کرتے کرتے جھومنے لگتا..... پھر وہاں ناچتا رہتا..... مولانا رومی کے مصرعے پڑھتا..... کبھی اللہ کے ناموں کی تسبیح شروع کر دیتا میں پوچھتا تمہیں کیا ہو رہا ہے..... کہتا تھا پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے..... کوئی مجھے بلا رہا ہے..... کوئی ہے جسے میں بیان نہیں کر پاتا..... لیکن اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرا وجود جھومنے لگتا ہے.....“ وہ جیسے مومن سے بات کرتے ہوئے اُس کمرے میں طحہ کو ناچتے دیکھ رہے تھے۔ فرش پر چکر کاٹتے اُس کے پیر..... یہاں سے وہاں جاتے ہوئے۔ مومن کو سمجھ نہیں آیا وہ کیا کہہ رہے تھے کس کی بات کر رہے تھے۔ ”انسان کی محبت نچو اسکتی ہے دادا..... اللہ کی محبت کیسے نچو اسکتی ہے..... یہ سمجھ نہیں

آتا۔“ اُس نے کہا تھا اور عبدالعلیٰ ہنسنے لگے تھے۔ پھر ہنستے ہی چلے گئے تھے۔ یہاں تک کہ اُن کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔ ”پھر تم انتظار کرو قلبِ مومن..... یہ راز بھی کھلے گا تم پر۔“ انہوں نے بڑے عجیب سے لہجے میں اُس سے کہا تھا۔ وہ اُن کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اُس نے مدہم آواز میں کہا۔ ”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا دادا۔“

”کس سوال کا؟“ عبدالعلیٰ نے پوچھا تھا۔ ”آپ نے اُنہیں کس کام سے روکا تھا؟“ ایک لمبی خاموشی آئی تھی۔ قلبِ مومن اور عبدالعلیٰ ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے پھر قلبِ مومن نے عبدالعلیٰ کو بڑبڑاتے سنا۔ ”حسنِ جہاں سے شادی ہے۔“ اس بار قلبِ مومن کے پاس کوئی سوال باقی نہیں بچا تھا۔



”فیصل آیا ہے اپنی امی کے ساتھ۔“ ثریا کی آواز میں ایسی خوشی اُس نے جہانگیر کے بعد پہلی بار سنی تھی وہ اُس وقت فون پر اپنے ایجنٹ سے اپنی ٹکٹ کی بکنگ کی تفصیلات سنتے ہوئے کمرے میں ٹہل رہی تھی جب ثریا لپکتی جھپکتی کمرے میں اُسے یہ خبر سنا کر یہ کہہ کر چلی گئی تھی۔ ”جلدی سے کپڑے بدل کر آجانا..... تمہارے ابا بھی ہیں۔ مجھے لگتا ہے خوش خبری لے کر آئے ہیں۔ مٹھائی لائے ہیں۔“ مومنہ کو نہ اُن کی بات ٹھیک سے سمجھ میں آئی تھی نہ ہی دوسری طرف ایجنٹ کی بات۔

”آپ مجھے کچھ دیر میں کال کریں۔“ مومنہ نے ایجنٹ سے کچھ معذرت کرتے ہوئے کال بند کی تھی اور پھر جیسے فون بند کر کے اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ ثریا کیا کہہ کر گئی تھی۔

”بڑا افسوس ہوا مجھے بھی جہانگیر کا سن کر، اللہ اُس کی بخشش فرمائے اور آپ سب کو صبر عطا فرمائے..... یہ موقع تو نہیں تھا کہ میں ایسی بات کروں لیکن فیصل کی بڑی خواہش تھی کہ ہم آپ سے مومنہ کے لئے بات کرتے۔“ دروازے میں داخل ہونے سے بہت پہلے مومنہ نے فیصل کی امی کی آواز سن لی تھی اور وہ عجیب بے یقینی کی کیفیت میں وہاں ٹھکی تھی۔

”ہماری بڑی خوش قسمتی ہوگی اگر ہمیں فیصل جیسا بیٹا مل جائے..... یوں لگے گا جیسے جہانگیر کی کمی پوری ہو جائے گی۔“ خوشی سے کھنکٹی یہ آواز سلطان کی تھی۔ مومنہ عجیب سی کیفیت میں اندر آئی تھی۔ اندر کمرے میں فیصل کی والدہ پسینے میں شرابور بیٹھی تھیں اور ثریا اُنہیں پنکھا جھلنے میں مصروف تھی کیونکہ لائٹ گئی ہوئی تھی۔ فیصل کی سفید ڈریس شرٹ بھی اس وقت پسینے سے نچڑی اُس کے جسم سے چپکی ہوئی تھی۔

”یہ لیس مومنہ بھی آگئی۔“ ثریا نے اُسے دیکھتے ہی چمکتے ہوئے کہا۔ ”السلام علیکم۔“ اُس نے گڑبڑا کر سلام کیا تھا۔ فیصل کی امی اُٹھ کر اُس سے ملیں۔ اُس کو گلے لگایا، گال پر پیار کیا۔

”فیصل نے مجھے آپ کے آنے کا بتایا ہی نہیں۔“ مومنہ نے مسکرا کر اُن کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

”اچھا..... کیوں فیصل؟“ فیصل کی والدہ کو اُس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا لیکن انہوں نے یہی ظاہر کیا تھا کہ اُنہیں یقین آ گیا تھا۔

”بس میں نے سر پرانز دینا تھا تمہیں۔“ فیصل نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ اُسے مسکرا کر دیکھا۔

”میں بوتلیں لے کر آتا ہوں..... اتنی دیر کر دی جھومرنے۔“ سلطان کو یک دم خیال آیا تھا مہمان ابھی تک پانی کے بغیر بیٹھے تھے۔

”کولڈ ڈرنکس کی کوئی ضرورت نہیں..... آپ انہیں منع کر دیں۔“ فیصل کی امی نے جاتے ہوئے سلطان کو دیکھ کر ثریا سے کہا۔ وہ اب ساتھ اپنے دوپٹے کے پلو سے خود کو ہوا دینے لگی تھیں۔

”نہیں نہیں لانے دیں اُنہیں..... اتنی گرمی میں آئے بیٹھے ہیں آپ لوگ..... بس یہ بیڑا غرق ہو K-Electric والوں کا..... وقت بے وقت بجلی غائب کر دیتے ہیں۔“ ثریا نے سلطان کو نہیں روکا تھا۔

”عادت ہی نہیں رہی اب ایئر کنڈیشنرز کے بغیر کہیں بیٹھنے کی۔“ فیصل کی امی کے انداز میں نخوت نہیں تھی وہ کچھ جتا بھی نہیں رہی تھیں اور مومنہ کو کوئی توہین بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اُن کے گھر اپنی مرضی سے آئے تھے اور مومنہ سلطان کو کوئی طلب تھی نہ توقع اور وہ جیسے عجیب سکون میں تھی۔ زندگی میں ایسی قناعت کبھی کبھی عطا ہوتی ہے۔

”تم کیا کر رہی ہو آج کل۔“ اُنہیں اچانک مومنہ سے پوچھنا یاد آیا۔ مومنہ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر اُس سے پہلے ثریا بول اُٹھی۔ ”آج کل تو کچھ بھی نہیں..... فلم کی آفر تھی مگر چھوڑ دی اُس نے۔“ ثریا جیسے کسی مجرم کی صفائیاں دے رہی تھی مومنہ نے حیران ہو کر ماں کو دیکھا۔

”فلمیں تو ہوتی ہی واہیات ہیں یہاں..... اچھا کیا چھوڑ دیا..... اُن میں کام کر کے کیا کرنا۔“

فیصل کی امی نے بے اختیار کہا۔ ”ہالی ووڈ کی فلم تھی۔“ ثریا چھپاتے چھپاتے بھی بیٹی کی achievement جتا گئی۔

”پھر تو اور بھی واہیات ہوگی۔“ فیصل کی والدہ کے جواب نے سب پر جیسے خاموشی طاری کر دی تھی۔

”مئی یہ دیکھیں یہ خطاطی مومنہ کی ہے۔“ فیصل نے دیوار پر لگی ایک خطاطی دیکھ کر ماں کو اُس کی طرف متوجہ کیا۔

”اچھا یہ بھی کر لیتی ہے۔“ اُس کی ماں کو جیسے پہلی اچھی چیز نظر آئی مومنہ سلطان کے فائن آرٹس کے پروفائل میں۔

”جب چھوٹی تھی نا تو اپنے ابا کا میک اپ باکس کھول کر لپ اسٹک نکال کر گھر کی ساری دیواروں پر یہی بناتی رہتی تھی۔ اسے بڑا شوق تھا آرٹسٹ بننے کا۔“ ثریا نے فخریہ انداز میں مومنہ سلطان کی ایک اور خصوصیت گنوائی۔ فیصل کی والدہ اسی طرح دوپٹے کے پلو سے اپنے آپ کو ہوا دیتی رہیں۔ کراچی کی گرمی نے اُن کے سارے سوال و جواب بلا کر رکھ دیئے تھے۔

باہر گلی میں دروازے پر کھڑے سلطان نے بڑی خفگی سے جھومر سے وہ پلاسٹک کا شاپر پکڑا تھا جس میں وہ چار کولڈرکس ڈالے شاپر جھلاتا ہلاتا تیزی سے آیا تھا۔

”کب سے بھیجا ہوا ہے تجھے جھومر اور تو گھنٹہ لگا کر آئی ہے۔“ سلطان کہے بغیر نہیں رہ سکا۔ ”گھنٹہ کہاں..... 45 منٹ ہوئے ہوں گے زیادہ سے زیادہ۔“ جھومر کو اس دروغ گوئی پر غصہ آیا تھا۔ ”وہ کریم کریا نے والا تو دے ہی نہیں رہا تھا کیونکہ تیرا لمبا اُدھار ہے وہاں..... پر جب میں نے مومنہ باجی کے رشتے کا بتایا تو دے دیں اُس نے بوتلیں مگر گرم آگ..... فریزر خراب تھا اُس کا..... میں آگے برف پکڑنے چلا گیا کہ تو نے اگلا کام یہ بتانا تھا..... اور تو میرا گھنٹہ گن رہا ہے۔“ جھومر نے کلائی میں چڑھایا برف والا دوسرا شاپر بھی سلطان کو تھمایا۔

”پہل بڑی مہربانی تیری۔“ سلطان نے شاپر پکڑتے تیزی سے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ”دفنکشن میں نے ہی کرنا ہے مومنہ باجی کا..... ابھی سے بتا رہی ہوں..... اور ولیمہ پر بھی جاؤں گی ساتھ لڑکے والوں کے گھر تمہارے ساتھ۔“ جھومر نے جاتے جاتے بالوں اور دوپٹے کو جھٹک کر آواز دی تھی۔ ”ہاں ہاں..... تجھے کیسے پیچھے چھوڑ کر جائیں گے۔“ سلطان نے ہنستے ہوئے کہا تھا اور سلطان اور جھومر کے درمیان ہونے والی یہ ساری گفتگو اندر کمرے میں بیٹھی فیصل کی امی نے پنکھا جھلتے ہوئے اپنے پسینہ خشک کرنے کی کوششوں کے دوران سنی تھی۔

”میں بس ذرا رسم کرنا چاہ رہی تھی..... اگلی بار انگوٹھی لائیں گے تو ساتھ ہی طے کر لیں گے

شادی کی تاریخ، انہوں نے پرس کھول کر اُس کے اندر کچھ ڈھونڈنا شروع کیا۔ وہ بازار کی برف کے ساتھ اُس کو لڈ ڈرنک کو پینے کا رسک نہیں لے سکتی تھیں جو شاید وہاں جعلی ہی ہوتی۔ بیٹے کی شادی وہاں کر کے جتنا بڑا رسک انہوں نے لینا تھا لے لیا اب دوسرا رسک لینے پر وہ تیار نہیں تھیں۔ سلطان تب تک ٹرے میں بوتلیں اور گلاسوں میں برف ڈالے لنگڑاتا ہوا اندر آ گیا تھا۔ ٹرے اُس کے ہاتھ سے فیصل نے پکڑ کر میز پر رکھی تھی اور اس سے پہلے کہ سلطان یا ثریا فیصل اور اُس کی ماں کو بوتلیں آفر کرتے فیصل کی امی نے پانچ پانچ ہزار کے دونوٹ مومنہ کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے اُس کی ہتھیلی بند کی تھی۔

”یہ لو بیٹا بہت مبارک ہو..... اکلوتا بیٹا ہے میرا فیصل..... اُسے انکار نہیں کر سکتی تھی..... اس لئے میں ہی جھک گئی اب اللہ کرے سب اچھا رہے۔“ انہوں نے مومنہ کے ماتھے پر پیار کیا اور ساتھ ہی اپنے رنج اور افسوس کا اظہار بھی۔

”آپ کو مبارک ہو بہت بہت..... سب اچھا ہی رہے گا انشاء اللہ۔“ اپنی آنکھوں میں آئی نمی دوپٹے سے رگڑتے ہوئے ثریا نے کہا۔ وہ ضرورت مند تھے ضرورت مند لفظ اور لہجہ نہیں پکڑے تھے۔ ”ارے منہ تو میٹھا کرو اوں میں سب کا ذرا باہر سے مٹھائی لا کر..... میں بھی کسی بے وقوف ہوں آرام سے بیٹھی ہوں۔“ ثریا یک دم اٹھ کر باہر گئی تھی اور مومنہ ہونقوں کے انداز میں وہ دس ہزار ہاتھ میں پکڑے بیٹھی رہی۔



برآمدے میں آ کر ثریا رُکی تھی۔ دوپٹہ آنکھوں پر رکھ کر اُس نے جیسے ایک سسکی بھری اور بڑبڑائی۔

”جہانگیر کچھ دن اور ٹھہر جانا۔“ آنسو بے قابو ہو کر اُس کی آنکھوں سے چھلکے مگر اُس نے دوپٹے سے آنکھیں رگڑتے ہوئے مٹھائی کا ٹوکرا کھولنا شروع کر دیا۔ جہانگیر کے لئے بہت روچکی تھی۔ وہ اب مومنہ کے لئے ہنسنا چاہتی تھی۔



پیاز چھیلی مومنہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور زندگی میں پہلی بار اُسے پیاز کی قدر و قیمت معلوم ہوئی تھی۔ وہ اُس کی آنکھوں کے سوکھے دھانوں کو نم کر گئے تھے۔

”کیا ضرورت ہے خواخواہ میں پیاز چھیلنے بیٹھنے کی..... بس بند کر یہ ہانڈی چولہا..... میں خود کر لوں گی آج سے سب کچھ۔“ ثریا نے آ کر اُس سے سبزی کاٹنے کی چھری اور برتن لیا تھا۔ فیصل اور اُس

کی والدہ کو گھر سے نکلے کچھ دیر ہی ہوئی تھی اور وہ کھانا بنانے کے لئے باورچی خانہ نما اُس چھوٹی سی جگہ میں آگئی تھی جو انہوں نے برآمدے کے ایک کونے میں ہی چولہا رکھ کر بنائی ہوئی تھی۔

”اماں ابھی سے مایوں بٹھائیں گی کیا..... ابھی تو ہاں کر کے گئے ہیں وہ لوگ۔“ اُس نے ماں کا مذاق اڑایا تھا۔ ”ہاں ہاں ابھی سے مایوں بٹھاؤں گی۔ جا کر آنکھیں صاف کر..... کیسے سرخ ہو رہی ہیں۔“ ثریا سے اُس کی آنکھوں کا پانی جیسے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ مومنہ نے چوکی پر بیٹھے بیٹھے دوپٹے سے آنکھیں رگڑ لیں۔ جو کچھ ابھی کچھ دیر پہلے ہوا تھا وہ اب بھی اُسے کسی خواب کی مانند ہی لگ رہا تھا۔ مٹھائی کا آدھ کھلا ٹوکرا جو آدھا تقریباً خالی تھا اور اُس کے قریب پڑی وہ مٹھائی کی پلیٹ جس میں سے فیصل کی امی نے اُس کو مٹھائی کھلائی تھی۔ وہ سب کچھ برآمدے میں ہی باورچی خانہ کے چولہے کے پاس پڑے تھے۔ کولڈ ڈرنکس بھی اُسی ٹرے میں رکھی ہوئی تھیں اور گلاسوں میں پڑی ہوئی برف اب پانی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اور ان سب چیزوں کے بیچوں بیچ مومنہ سلطان اُس چوکی پر اپنے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے وہ ابھی ابھی ان سب چیزوں کے ساتھ پتھر سے گوشت پوسٹ کے جیسے جاگتے وجود میں تبدیل ہوئی ہو۔ وہ سناٹا جو جہانگیر نے اُس گھر پر طاری کیا تھا۔ وہ فیصل نے جیسے توڑ دیا تھا۔

”معجزے صرف پیار میں ہوتے ہیں۔“ مومنہ کو اقصیٰ کی بات یاد آئی اور وہ بات سے بھی

زیادہ۔

”اقصیٰ کو تو بتا دے فون پر۔“ ثریا کو بھی اقصیٰ اُسی لمحے یاد آئی تھی جیسے کوئی ٹیلی فون پر ہوئی تھی۔ ”فون بند تھا اُس کا اماں۔ شوٹ پر ہے وہ۔“ مومنہ نے جواباً کہا۔ تبھی سلطان ایک خالی ٹرے پکڑے بیرونی دروازہ سے اندر داخل ہوا تھا۔ ”یہ پکڑ پورے محلے میں بانٹ آیا مٹھائی مبارکیں دے رہے تھے سب۔“ مومنہ نے سلطان کے کھلے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ ”خیر مبارک۔“ ثریا نے ہنستے ہوئے جواباً کہا تھا۔ ”وہ جھومر کے لئے رس گلے اور گلاب جامن الگ سے نکال دینا..... لڈو پیتا لینے سے صاف انکار کر دیا اُس نے..... شام کو آئے گی وہ اپنا حصہ لینے۔“ سلطان نے اُسی طرح ہنستے ہنستے بتایا۔ ”ہاں ہاں لے لے سارے رس گلے..... اُس سے رس گلے اچھے ہیں کیا؟“ ثریا ہنسی تھی۔

”اتنی لمبی گاڑی تھی ان لوگوں کی..... محلے والوں کو تو پہلے ہی گریہ لگ گئی تھی۔ پہلے تو سمجھ رہے تھے کوئی پروڈیوسر آیا ہے۔“ سلطان کرسی کھینچ کر برآمدے میں بیٹھے ہوئے بولا۔

”ماشاء اللہ اللہ نے کیسا نصیب کھولا ہے میری مومنہ کا..... شہزادہ بیاہ لے جائے گا یہ لمبی گاڑی میں..... بڑے سے گھر میں رہے گی..... نظر نہ لگے۔“ ثریا نے اُس کی بلائیں لے کر اپنا سر چھوا۔ مومنہ

مسکرا دی تھی۔ اُس کے خوابوں کی ریل گاڑی اتنی لمبی نہیں تھی جتنی سلطان اور ثریا کی تھی۔ اُس نے انہیں ٹوکا نہیں تھا۔ اُس گھر میں اتنے عرصہ بعد ایسی خوشی آئی تھی۔

”بیگم صاحبہ بن کر آیا کرے گی اب تو اپنی گاڑی میں ہم سے ملنے۔“ سلطان نے بھی بڑے فخریہ انداز میں اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ابا میں بس سے ہی آجایا کروں گی۔“ مومنہ نے یک دم کہا۔ ”نہ نہ گاڑی میں ہی آنا..... بہت کھا لئے بسوں اور ویگنوں کے دھکے..... اب اللہ دے رہا ہے تو ناقدری کیوں کرے گی؟“ ثریا نے فوراً اُسے ٹوکا تھا۔

”اور پیدل آئے گی اور کوئی پرس چھین کر بھاگ گیا تو..... اور دیکھ زور وغیرہ پہن کر بالکل مت آنا یہاں۔“ سلطان کو ایک اور خدشہ ہوا۔ مومنہ بے اختیار ہنسی۔ ”کیا خیالی پلاؤ چل رہے ہیں ابا..... میں مومنہ سلطان ہوں..... ساری عمر گزاری ہے اس محلے میں..... کون چھینے گا میرا پرس؟“

”مومنہ سلطان سے نہیں چھینتے تھے۔ مومنہ فیصل سے چھین لیں گے..... بتا رہا ہوں تجھے اپنی برادری کا پتہ ہے مجھے۔“ سلطان نے اُسی سنجیدگی سے کہا اور تبھی مومنہ کا فون بجنے لگا تھا۔ ”فیصل کا فون آرہا ہے۔“ وہ فون لے کر یک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”ہاں ہاں جاسن لے۔“ ثریا نے فوراً کہا۔ مومنہ فون لئے اندر کمرے میں چلی گئی۔ ”کیسے چہرہ کھل گیا ہے پل بھر میں۔“ ثریا مسکرائی۔ ”ماشاء اللہ بول۔“ سلطان نے ٹوکا۔ ”دل میں بولا ہے میں نے۔“ ثریا نے بے ساختہ کہا۔ ”دن پھرنے لگے ہیں ہمارے ثریا..... دیکھ۔“ سلطان نے اوپر چھت کو دیکھتے ہوئے آہ بھری تھی۔ ”اس کے انتظار میں ہی عمر گزاری تھی ہم نے..... اچھا وقت آ گیا ہے۔“ سلطان بڑبڑایا مگر جو اُس کے لبوں پر نہیں آیا تھا۔ وہ ثریا کے کانوں تک پہنچ گیا تھا۔ اُس نے بھی جہانگیر کو یاد کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”تم سے کہا تھا نا میں پھر آؤں گا۔“ فیصل نے اُس کی آواز سنتے ہی کہا تھا۔ مومنہ ہنس پڑی۔ ”یہ سب کیسے ہوا؟“ اس کے پاس آج سوال کے لئے بھی صحیح لفظ نہیں تھے۔ ”بس دیکھو ہو گیا..... میری محبت کی صداقت۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”یقین آیا؟“ ”کر رہی ہوں۔“ ”کل ملیں؟“ ”لنچ یا ڈنر؟“ اُس نے فوراً کہا تھا۔ ”لنچ۔“ ”چلو ٹھیک ہے۔ بس پھر کل ہی ملتے ہیں۔ تم سے کچھ بہت ضروری باتیں بھی کرنی ہیں اور تمہاری رنگ کا سائز بھی چاہیے مجھے..... می آج بھول گئی تھیں۔“ فیصل ایسا ہی تھا اُسے بہت کچھ اکٹھا یاد آرہا تھا۔

”چڑیل کمینی..... بیٹھے بٹھائے اتنا بڑا کارنامہ اور مجھ سے رازداریاں۔“ اُس نے فون ابھی

بند ہی کیا تھا جب اقصیٰ اُسی طرح شور مچاتی اندر داخل ہوئی تھی اور آکر اُس سے لپٹی تھی۔ ”تمہیں پتہ کیسے چلا؟“ مومنہ ہنسنے لگی تھی۔ ”انکل کا فون آیا تھا مجھے..... شوٹ چھوڑ کر آ گئی ہوں..... I am so happy for you۔“ وہ پر جوش انداز میں اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”ذرا دیکھو اپنا چہرہ کیسے چمک رہا ہے۔“ وہ اُسے کھینچتے ہوئے کمرے میں لگے آئینے کے سامنے لے گئی تھی۔ ”دیکھو دیکھو کیا یہ تم ہو؟“ وہ اُسے چھیڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ مومنہ نے اُس سے بازو چھڑایا اور ہنستے ہوئے آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ ”بس کر دو اب۔“ وہ اب بلبش ہو رہی تھی۔ ”شادی وغیرہ کا کیا سلسلہ ہے؟“ اقصیٰ نے فوراً پوچھا تھا۔ ”جلد ہی کرنا چاہتے ہیں وہ شاید ایک آدھ مہینے میں۔“ اُس نے جواباً بتایا۔ ”مگر ابھی تو تمہیں امریکہ جا کر اپنی فلم کی شوٹنگ مکمل کروانی ہے۔“ اقصیٰ کو فوراً یاد آیا۔ ”ہاں ظاہر ہے فلم کے تو بعد میں ہی ہوگا..... میں ویسے بھی مل رہی ہوں فیصل سے کل..... تو پتہ چل جائے گا کہ کب شیڈول ہوگی۔“ مومنہ نے بتایا۔ ”اوہ ہولملاقاتیں بھی شروع۔“ اقصیٰ نے چھیڑا۔ ”اچھا اچھا تنگ مت کرو مجھے..... داؤد کیسا ہے؟ اُس کو بتایا؟“ مومنہ نے بات بدلنے کی کوشش کی۔ ”وہ تو ترکی چلا گیا ہے مومن کی فلم کی ریکی کرنے..... رات کو فون کروں گی تو بتاؤں گی۔“ اقصیٰ نے فوراً کہا۔

”آج مومن کا نام مت لو میرے سامنے۔“ مومنہ نے بے اختیار کہا۔ ”میں داؤد کا بُرا نہیں چاہتی مگر تم دیکھ لینا اقصیٰ یہ فلم نہیں بنے گی..... بنے گی تو فلاپ ہوگی..... اُسے اتنا نقصان ہوگا کہ اُس نے جو کمایا سب گنوائے گا..... میں نے زندگی میں کسی کو بددعا نہیں دی لیکن قلبِ مومن کے لئے میرے دل سے آج بھی بددعاؤں کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا۔“

اقصیٰ اُس کے سامنے کچھ کہہ نہیں سکی۔ وہ خوشی کے اس لمحے میں کیا سوچ کر آتش فشاں بنی تھی۔ وہ جانتی تھی۔

”سب بھول جاؤ..... سب پیچھے رہ گیا۔“ اقصیٰ نے اُسے بہلایا تھا۔ ”یہ ایک فلم میں وقت پر سائن کر لیتی تو آج جہانگیر.....“ وہ کہتے کہتے رُکی تھی..... آگے کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ خاندان جہانگیر کو مکمل بھول جانے میں ابھی کئی دہائیاں لیتا۔

☆.....☆.....☆

”مومن بھائی ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“ وہ رات کو سونے کے لئے لیٹنے لگا تھا جب اچانک داؤد کا فون آیا تھا۔ قلبِ مومن کو پہلا خیال فلم کی ریکی سے متعلق آیا تھا۔ ”کیا ہوا؟“ اُس نے کچھ متفکر ہو کر پوچھا۔ ”آپ نے سوشل میڈیا پر جا کر اپنی تصویریں دیکھیں؟“ داؤد نے کچھ جھجکتے جھجکتے کہا۔ ”کون سی

تصویریں؟“ وہ اُلجھا۔ ”وہ کسی نے آپ کی کچھ پکچرز leak کر دی ہیں سوشل میڈیا پر..... کچھ پرسنل قسم کی..... تو وہ وائرل ہو گئی ہیں۔“ مومن ہکا بکا ہو گیا تھا۔ ”میں دیکھتا ہوں..... بس یہی مسئلہ تھا؟“ ”نہیں وہ اختر بھائی نے لیگل نوٹس بھیجا ہے آفس کے ایڈریس پر۔“ داؤد نے بالا آخر وہ مسئلہ بتایا جس کے لئے اُس نے فون کیا تھا۔ ”لیگل نوٹس کس لئے؟“ وہ حیران ہوا۔ ”ایک کروڑ مانگ رہے ہیں damages میں صنم کے سکرپٹ سے علیحدہ کئے جانے پر۔“ مومن نے ہونٹ پھینچتے ہوئے کہا۔ ”اُس کا دماغ خراب ہو گیا ہے..... ایک کروڑ اُس نے کبھی خواب میں بھی دیکھا ہے؟“ وہ بے ساختہ خفا ہوا تھا۔ ”مجھے لگتا ہے اس سب کے پیچھے کوئی ہے..... مجھے یہ ڈر ہے اختر بھائی بھی سوشل میڈیا پر نہ چلے جائیں۔“ داؤد نے نہا کا نام لئے بغیر جیسے اُسے خبردار کیا۔ ”میں جانتا ہوں کون ہے اس سب کے پیچھے۔ اور جو ہے اُس کو بھی دیکھ لوں گا۔“ مومن نے کہتے ہوئے فون بند کیا اور لیپ ٹاپ پر اُس نے وہ لنکس کھول لئے جو داؤد نے اُسے بھیجے تھے۔ تصویروں پر نظر پڑتے ہی جیسے اُس کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا تھا۔ وہ اُس کی کچھ beaches پر کچھ ماڈلز کے ساتھ تصویریں تھیں اور وہ تصویریں نہا کے علاوہ کوئی اور اُس کے فون سے نہیں نکال سکتا تھا۔ وہ تصویریں فیس بک اور twitter پر مختلف فلم اور TV کے پیجز نے share کر رکھی تھیں اور اُن تصویروں کے نیچے comments کے thread میں قلب مومن اور اُن ماڈلز کو ہر طرح کی گالیاں دی جا رہی تھیں۔ قلب مومن نے چند comments پڑھنے کے بعد مزید comments پڑھنے بند کر دیئے تھے۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس وقت اگر وہ پاکستان میں ہوتا تو اُس کی ان ساتھی ماڈلز کی طرف سے آنے والی کالز نے بھی اُس کی زندگی اجیرن کر دی ہوتی کیونکہ وہ پرسنل تصویریں تھیں اور اُن میں سے ہر ایک یقیناً یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ تصویریں قلب مومن نے شیئر کی تھیں اور اپنی ان گرل فرینڈز کے سامنے قلب مومن کو اب جس طرح کی صفائیاں اور وضاحتیں دینی پڑنی تھیں۔ قلب مومن کو اُن کی سنگینی اور نزاکت کا اندازہ تھا، نہا کے علاوہ یہ کام کوئی اور نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اُس کے فون تک صرف نہا ہی کو access تھی۔

اُس نے اگلی کال نہا کو کی تھی مگر نہا نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔ قلب مومن جلتا بھنتا اُس کو بار بار بار کالز کرتا رہا۔ اُس کی کوئی کال اٹینڈ نہیں ہوئی تھی۔ اُس کے چھوڑے ہوئے کسی msg کا جواب نہیں آیا تھا اس کے باوجود کہ وہ دیکھ لئے گئے تھے۔



”تم کیا رات کو سوئے نہیں؟“ وہ اگلی صبح دادا کے کمرے میں آیا تھا تو انہوں نے اس کا چہرہ

دیکھتے ہی کہا تھا۔ ”ہاں بس نیند نہیں آئی مجھے..... نئی جگہ پر نیند نہیں آتی مجھے۔“ مومن نے جیسے گول مول انداز میں جواب دیا تھا۔ اُس کا ذہن مسلسل الجھا ہوا تھا۔ ”یہ نئی نہیں یہ تو پرانی جگہ ہے۔“ دادا نے جیسے اُسے یاد دلایا۔ وہ جواب دینے کی بجائے اُس ایزل کے سامنے کھڑا ہو گیا جس پر رکھے کینوس پر وہ کچھ paint کر رہے تھے۔ ”اسے پہچانتے ہو؟“ دادا نے یک دم دیوار پر لگی ایک کیلی گرائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس سے کہا۔ مومن نے گردن موڑ کر اُس کیلی گرائی کو دیکھا۔ ایک چھوٹے سے کینوس پر صرف اللہ کا لفظ لکھا ہوا تھا..... بہت خوبصورت رنگوں لیکن بے حد غیر ہموار لکیروں میں۔ وہ اُس کی اپنی خطاطی تھی۔ اُس کی پہلی خطاطی جب وہ دادا کے پاس آ گیا تھا۔ اُسے یاد آیا۔ اس گھر میں گزارا ہوا پہلا دن۔

”میں نے لکھ لیا۔“ قلب مومن نے فخریہ انداز میں عبدالعلی سے کہا تھا۔ ”بہت خوبصورت لکھا۔“ انہوں نے اُسے داد دی تھی۔ ”لیکن بس اللہ کا الف تھوڑا ٹیڑھا ہو گیا..... ہے نا دادا؟“ قلب مومن نے الف پر انگلی پھیرتے ہوئے جیسے کچھ تشویش سے اپنے دادا سے کہا تھا۔ ”جب بار بار اللہ کا نام لکھتے رہو گے تو سب کچھ سیدھا ہو جائے گا..... الف بھی۔“ عبدالعلی نے اُس کے ہاتھ سے برش لے کر اُسکے الف پر پھیرتے ہوئے اُسے جیسا سیدھا کرنے کی کوشش کی تھی مگر کیا نہیں تھا۔

ایک جھماکے کے ساتھ وہ سین ذہن پر لہرایا تھا اور اُسی طرح غائب ہو گیا تھا۔ قلب مومن نے انگلی الف پر پھیرتے ہوئے دادا سے کہا۔ ”الف آج بھی ٹیڑھا ہے میرا۔“ ”تم نے اللہ کا نام لکھنا بھی تو چھوڑ دیا ہے اب۔“ اُسے اپنے عقب میں عبدالعلی کی آواز آئی۔ ”ہاں شاید میں مومن ہوں نا..... ساری غلطی ہمیشہ مومن ہی کی ہوتی ہے..... آئیں ناشتہ کرتے ہیں۔“ اُس نے عجیب سے انداز میں کہہ کر جیسے اپنی احساس ندامت اور احساس جرم کو جھٹکا تھا اور کمرے سے چلا گیا تھا۔



وہ پہلی بار کسی ڈرامہ کی شوٹنگ کے لئے نہیں آج اپنے لئے تیار ہوئی تھی اور بار بار اُسے لگ رہا تھا جیسے بہت تیز میک اپ کر لیا تھا۔ کچھ زیادہ ہی بلوڈرائی کر لئے تھے بال۔

ریسٹورنٹ میں لنچ کے لئے فیصل کے بالمقابل بیٹھی وہ پہلی بار نروس ہو رہی تھی۔ اُس کی مسکراہٹ اور نظروں سے۔ اپنے ہاتھوں میں اپنی ایک imitation انگوٹھی اُس نے چند لمحے پہلے فیصل کو تھمائی تھی اور وہ انگوٹھی ابھی تک فیصل کے ہاتھ میں تھی جو وہ غائب الذہنی میں اپنی انگلیوں میں گھما رہا تھا۔

”سب باتیں کر رہے ہوں گے آج..... سیٹ سے آئی ہوں اور پہلی بار اس طرح کسی مرد کے

ساتھ سیٹ سے کہیں گئی ہوں۔“ مومنہ نے ہنستے ہوئے اُسے بتایا تھا۔ وہ ایک سیریل کے سیٹ پر اپنا کام
وانڈاپ کروا رہی تھی جہاں سے فیصل نے اُسے پک کیا تھا۔

”اندازہ ہے مجھے اس لئے تو نہیں چاہتا کہ تم اس انڈسٹری میں کام کرو۔“ فیصل یک دم سنجیدہ
ہوا تھا۔ ”میں سمجھی نہیں۔“ اُس کی مسکراہٹ بھی غائب ہو گئی تھی۔ ”کیا؟“ فیصل اُس کے سوال پر حیران
ہوا تھا۔ ”کام نہ کرنے والی بات۔“ مومنہ نے کہا۔ ”آنٹی نے کہا تھا تم انڈسٹری چھوڑ رہی ہو اور اب کام
نہیں کرو گی اسی لئے تو میں اپنے پرنٹس کو منا پایا۔ آنٹی نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اور انکل بھی اس فیلڈ کو چھوڑ
دیں گے۔“ فیصل نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ مومنہ اُس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ”انہوں نے کہا تھا کہ وہ اپنا کام
چھوڑ دیں گے؟“ اُسے یقین نہیں آیا۔ ”ہاں کیا تم سے بات نہیں ہوئی اُن کی؟“

”نہیں۔“ مومنہ نے جواباً کہا۔ ”کوئی بات نہیں اب کر لیتے ہیں آج میں اسی مسئلے پر بات کرنا
چاہتا تھا تم سے تاکہ clarity ہو جائے سب باتوں پر۔“ فیصل نے اطمینان سے کہا تھا۔

”آنٹی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اب گانا گانا چھوڑنا چاہتی ہیں اور انکل بھی اب میک اپ
آرٹسٹ کے طور پر فلمز میں کام نہیں کریں گے۔“ مومنہ کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزرا تو اُس کے ماں
باپ نے اپنا فن پہلی بار بیچ دیا تھا اُس کے مستقبل کے لئے۔ اُسے تکلیف ہوئی۔ ”اور پھر وہ کیا کریں
گے؟..... کہاں سے کھائیں گے؟“ اس نے فیصل سے پوچھا۔ ”میں سپورٹ کروں گا اُنہیں..... مجھے
اندازہ تھا کہ وہ کام چھوڑیں گے تو اُنہیں مشکلات آئیں گی۔ جہانگیر کے علاج کی بات اور تھی لیکن گھر کا
خرچ تو میں چلا سکتا ہوں اُن دونوں کا۔“ اُسے فیصل کی اعلیٰ ظرفی اور نیت پر شبہ نہیں تھا پھر بھی وہ شرمسار
ہوئی تھی۔ ”فیصل یہ سب آسان نہیں ہے۔“ اُس نے اُسے ٹوکا۔ ”میں بنا دوں گا۔“ وہ جواباً بولا۔ ”تمہیں
اندازہ نہیں ہے پچھلے کئی سالوں سے جہانگیر کی وجہ سے ہم پر کتنا قرضہ جمع ہو گیا ہے۔“

”کتنا قرضہ ہے؟“ فیصل نے اُس کی بات کاٹ دی تھی۔ ”آٹھ دس لاکھ شاید اس سے بھی
زیادہ..... چھوٹی چھوٹی رقمیں ہیں مگر بہت لوگوں کو پیسے واپس کرنے ہیں ہم نے۔“..... ”میں ادا کروں گا
وہ سارا قرضہ..... آٹھ لاکھ..... دس لاکھ جتنا بھی ہے..... تم بس یہ کام چھوڑ دو۔“ فیصل نے دو ٹوک انداز
میں اُس سے کہا۔

”تم کیوں دو فیصل؟..... آخر تم کیوں دو؟“ وہ جذباتی ہوئی تھی۔ ”میرا بھائی تھا وہ میں نے
لوگوں کے سامنے اُس کے لئے ہاتھ پھیلا یا تھا۔ پھر اب دوسروں کا احسان اور خیرات لے کر اُس کا قرض
کیوں اُتاروں میں؟“ فیصل اُس کے جملے پر جیسے hurt ہوا۔ ”میں تمہیں خیرات دوں گا؟“ ”مجھے

خیرات ہی لگ رہی ہے۔“ ”نہیں ہے خیرات..... نہ ہی احسان ہے.....“ ”میرے ہاتھ دیکھو..... کیا تمہیں لگتا ہے یہ ہاتھ کمانہیں سکتے؟..... قرض ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے؟ پھر میں تم سے کیوں لوں؟“ مومنہ نے اسے اپنے ہاتھ دکھائے تھے اُس نے ایک نظر اُس کے ہاتھوں پر ڈالی پھر بے ساختہ کہا۔ ”لیکن تم ہاتھوں سے نہیں کماتی مومنہ۔“ مومنہ کو جھٹکا لگا۔ ”پھر کیسے کماتی ہوں میں؟“ ”چہرہ اور جسم دکھا کر۔“ فیصل نے روائی میں کہا اور بات کہنے کے بعد اُسے جیسے پچھتاوا ہوا مومنہ کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ فیصل نے یک دم اپنی آواز کو نرم کیا۔ ”ابھی تم TV کر رہی ہو پھر تم فلم کرو گی..... مرد کیسے دیکھتا ہے سکرین پر نظر آنے والی ایکٹریس کو..... تمہیں مجھ سے بہتر پتہ ہے..... میں اتنا لبرل نہیں ہوں کہ کبوتر بن کر آنکھیں بند کر لوں۔ میں تمہاری اور تمہارے ماں باپ کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہوں..... دل و جان سے اٹھاؤں گا..... پیار میں احسان نہیں ہوتا۔ حق ہوتا ہے..... مومنہ کچھ تو بولو۔“ اُس نے بات کرتے کرتے مومنہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر جیسے اُسے متوجہ کیا تھا۔ ”کیا بولوں؟..... تم نے کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا مجھے.....“ اُس نے ہاتھ کھینچتے ہوئے رنج سے کہا تھا۔ ”میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ سب کچھ صرف میں نہیں ساری دُنیا کہتی ہے اور کہتی رہے گی..... تمہیں یاد نہیں تم تو خود ایکٹنگ کو حرام سمجھتی تھی خود کہتی تھی کہ مجبوری میں کر رہی ہو۔ اب تو کوئی مجبور نہیں ہے۔“ ”تمہارے پاؤں میرے جوتے میں نہیں ہیں اس لئے تم کو میرے حالات کا اندازہ اور احساس نہیں ہے۔“ وہ رنجیدگی سے بولی تھی۔ ”لیکن مجھے ایک موقع دو میں یہ سارا قرض ادا کر دوں گی..... تمہارے پاس آ جاؤں گی پھر اُس کے بعد۔“..... ”فلم نہیں مومنہ..... میں تمہارا فلم میں کام کرنا قبول نہیں کر سکتا۔“ فیصل نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”اور TV میں کئی سال چھوٹے موٹے رول کر کے بھی یہ قرض ادا نہیں کر پاؤں گی..... یہ ایک فلم میرا سارا قرض اُتار دے گی۔“ فیصل کچھ جھنجھلایا۔ ”جب میں تیار ہوں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تو تم کیوں نہیں مان رہی میری بات؟..... یا میں یہ سمجھ لوں کہ تمہیں بھی شہرت کا چسکہ لگ گیا ہے..... میرے پیرنٹس پہلے ہی کہتے ہیں کہ ایک بار TV پر آ جانے والی گھر میں بیٹھ کر گھرداری نہیں کرے گی۔“ وہ اُس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ فیری ٹیل کا شہزادہ اپنی زہر آلود باتیں تو نہیں کہتا۔ اُس نے سوچا تھا اور شہرت کا چسکہ کیا تھا جس کا طعنہ وہ اُسے دے رہا تھا۔ اُس نے سوچا تھا۔ ”اس شہرت سے میں نے کچھ نہیں کمایا..... جہانگیر کے علاج کے پیسوں کے علاوہ تم مجھے جانتے ہو پھر بھی یہ کہہ رہے ہو۔“

”میں نہیں کہتا یار..... میرے ماں باپ کہتے ہیں..... انہیں منا تو لیا ہے میں نے..... لیکن بڑا مشکل کام ہے یہ یار..... اس لئے کہہ رہا ہوں تم ہی بات مان لو میری..... ممی تمہاری فلم کا سن کر پھر بگڑی

ہوئی ہیں..... پلیز مومنہ.....“ فیصل نے اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ وہ چپ بیٹھی رہی تھی۔ وہ مشکل میں تھی اور فیصل کو یہ لگ رہا تھا وہ اُس سے بڑی مشکل میں تھا۔

”کھانا آگیا..... کھانا کھاتے ہیں..... بس۔“ فیصل کو یک دم خیال آیا تھا وہ اُس سے مستقبل کی اور بھی اچھی اچھی باتیں کرنے کے لئے اُسے باہر لایا تھا۔

مومنہ خاموش ہو گئی تھی۔ فیصل نے اُس مہنگے ریسٹورنٹ کی سب سے مہنگی ڈشز اُس کے لئے منگوائی تھیں اور کچھ دیر پہلے کہے گئے تلخ جملوں کی تلخی کو مٹانے کے لئے جیسے اب اُسے خود سرو کرنے لگا تھا۔ ساتھ اُس سے ہلکی پھلکی گپ شپ کرنے لگا تھا۔ وہ اُس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اُس کی باتیں سنتی رہی۔

”مجھے تمہاری یہ عادت ہمیشہ سے پسند ہے۔“ فیصل نے یک دم کہا۔ ”کیا؟“ وہ چونکی۔ ”تم بہت توجہ سے بات سنتی ہو۔ دوسری لڑکیوں کی طرح اپنی بات نہیں کہتی۔“ وہ اُسے خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا یا واقعی سراہ رہا تھا مومنہ کو اندازہ نہیں ہوا۔ اُس نے اپنی پلیٹ سے اگلا لقمہ لیا تھا۔ پھر ایک اور..... پھر ایک اور..... کبھی کبھار بھوک مر جانے پر بھی انسان زبردستی اُسے کھلانے اور جگانے کی کوشش کرتا ہے بس اپنی عزت نفس اور خود داری کے لئے۔ پریوں کی کہانی میں شہزادی کو شہزادے کے لئے اور کیا کیا سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ اُس نے steak کے اُس ٹکڑے کو چند مشرومز کے ساتھ اپنے کانٹے میں پروتے ہوئے سوچا تھا۔



وہ ایک شاندار لمبی سی گاڑی میں اپنے گھر کے دروازے سے کچھ فاصلے پر اُترنے لگی تو فیصل نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اُس کا ہاتھ تھاما۔ "Thank You." مومنہ نے اُس کا چہرہ دیکھا۔ ”کس لئے۔“ ”اس فیصلے کے لئے..... میں سوچ رہا ہوں رنگ کا سائز لینے کی بجائے تمہیں ساتھ لے کر تمہاری مرضی کی رنگ دلاؤں۔“ اُس نے کہتے ہوئے اُس کی imitation رنگ واپس کر دی تھی۔ مومنہ نے اُس رنگ کو اپنی اُسی انگلی میں پہن لیا جس سے اُتار کر اُس نے اُسے فیصل کو دیا تھا۔ ”پھر ویک اینڈ پر لینے آتا ہوں تمہیں رنگ پسند کروانے کے لئے۔“ فیصل نے اُسے کہا۔ مومنہ نے اُس کا چہرہ دیکھا۔ وہ محبت کا چہرہ تھا اُس کی زندگی کی پہلی محبت کا..... ساری پاکیزگی ساری معصومیت ساری جذباتیت والی محبت..... جیسے پوسٹ کارڈ پر ایک پرفیکٹ پکچر والی محبت..... وہ اُس محبت کو ویسے ہی رکھنا چاہتی تھی۔ وہ مسکرائی تھی۔

”خدا حافظ۔“ وہ کہتے ہوئے اُس کا ہاتھ تھپک کر گاڑی سے اُتر گئی۔ فیصل اُسے جاتا دیکھتا

رہا..... ویسی ہی محبت سے..... محبت کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ اُسے ایک دوسرے کا چہرہ پہچاننا آتا ہے، پڑھنا نہیں۔



”پہلے تو میں نے اُسے صرف فلم سے نکالا ہے۔ اب میں اُسے سڑک پر لے آؤں گا..... دو ٹکے کا رائٹر ہے وہ..... اوقات کیا ہے اُس کی؟..... میں نے بریک نہ دی ہوتی تو آج بھی دھکے کھا رہا ہوتا..... احسان فراموش گھٹیا آدمی۔“ قلبِ مومن فون پر پوری قوت سے دھاڑ رہا تھا اور فون پکڑے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ٹہلتے ہوئے اُسے یہ اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ بیٹا کے ساتھ ہونے والی وہ فون کال عبد العلی بھی سن رہے ہوں گے۔

”سار پر اہلم نہیا کی وجہ سے ہو رہا ہے ورنہ اختر کی اتنی جرأت نہیں تھی۔ اسے وکیل بھی نہیا نے کر کے دیا ہے۔ ورنہ اختر تو اب بھی بہت ڈرا ہوا ہے اور patch up کی بات کریں فوراً تیار ہو جائے گا۔“ ”نہیا کو تو دیکھ لوں گا میں..... پلسٹی کی بھو کی عورت..... 50 بوائے فرینڈز ہوں گے اُس کے مجھ سے پہلے..... مجھے بھی بہت کچھ پتہ ہے اُس کے بارے میں۔“ وہ اُسی تلخ لہجے میں کہہ رہا تھا اور ساتھ ٹہل رہا تھا۔

”احسن کی فلم کا پریمیر ہو گیا بہت بُرے reviews ملے ہیں اُسے..... آپ نے سوشل میڈیا پر دیکھے..... flop ہوگی وہ۔“ بیٹا نے یک دم اُسے ضروری update دی۔

غصے میں بھی مومن قہقہہ لگانا نہیں بھولا تھا۔ ”زبردست بڑی اچھی خبر دی تم نے اپنی سوشل میڈیا ٹیم کو کہو وہ بھی بُرے review لکھے اُس کی فلم کے بارے میں..... دھجیاں اُڑا دے اُس کی فلم کی تھرڈ کلاس ڈائریکٹر اپنے آپ کو قلبِ مومن کا اُستاد کہتا ہے۔“

مومن شاید اسی تضحیک آمیز انداز میں بات کرتا رہتا اگر وہ یک دم دادا کو نہ دیکھ لیتا جو اچانک اُس کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے تھے۔

”مجھے ای میلز کر دو میں جواب دیتا ہوں اُن کا۔“ مومن نے بیٹا کو خدا حافظ کرتے ہوئے کہا۔

عبد العلی کے دیکھنے کا انداز اُسے کھلاتھا۔

”کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟“ فون بند کرتے ہی اُس نے دادا سے کہا۔ ”تمہیں۔“

”کیوں؟“ وہ اُلجھا۔ ”پہچان نہیں پا رہا۔“

”کیا؟“ وہ حیران ہوا۔ ”تمہیں..... یہ جو فون پر بات کر رہا تھا کیا یہ وہ قلبِ مومن تھا جو؟؟؟“

چڑیا کو گود میں لئے ساری رات بیٹھا رہتا تھا۔“ مومن چند لمحے بول نہیں سکا۔ ”وہ بچپن تھا دادا۔“ مومن نے نظریں چرائیں۔ ”اور جو اپنی ماں کے آنسو دیکھ کر اللہ کو خط لکھنے لگتا تھا کہ وہ اُس کی ماں کو بھیج دے۔“ انہوں نے بات جاری رکھی تھی۔ ”وہ میرے خونی رشتے تھے دادا۔“ وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔ ”اور جو راستے میں پڑے ہر پتھر کو اس لئے اٹھاتا تھا کہ کسی دوسرے کو ٹھوکر نہ لگے۔“

”آپ کو کرتے دیکھتا تھا اس لئے کرتا تھا۔“ وہ اب اُن سے نظریں چرانے لگا تھا۔ ”وہ مومن جہاں بھی جاتا تھا لوگوں کی آنکھوں کا تارہ بن جاتا تھا۔“ دادا پتہ نہیں اُسے کس کا چہرہ دکھانے لگے تھے۔

”لوگ آج بھی مجھ سے پیار کرتے ہیں دادا..... لاکھوں لوگ twitter پر مجھے follow کرتے ہیں۔ میری برتھ ڈے پر مجھے کارڈز، پھول، تحفے بھیجتے ہیں۔ میں آج بھی اُن کی آنکھوں کا تارہ ہوں۔ اُن کے دلوں میں بستہ ہوں۔“ اُس نے دادا کو چیلنج کیا۔

”وہ جو لوگوں کے دلوں میں بستہ تھا اُس سے میں پوچھتا تھا کہ وہ اُن سب لوگوں کے نام لکھے جو اُس کے دشمن ہیں تو اُس کا صفحہ خالی رہ جاتا تھا۔“ مومن گم صم ہوا۔ ”آپ مجھ سے کیا سننا چاہتے ہیں دادا؟“ اُس نے بالا آخر زچ ہو کر کہا۔ ”تم بدل گئے ہو مومن..... تم وہ قلبِ مومن نہیں رہے۔“ غلط..... میں ایک بہترین انسان ہوں آپ میرے سوشل سرکل میں آ کر میرے بارے میں پوچھیں اس ایک فون کال سے مجھے judge نہ کریں۔“ وہ مدافعا نہ انداز میں بولا تھا۔

”تم لوگوں کا رزق چھین سکتے ہو مومن؟ انہیں سڑکوں پر لانے کی طاقت رکھتے ہو؟“ عبد العلی نے جیسے اُس کے الفاظ دہرائے۔

”جس کے بارے میں یہ بات کہی ہے وہ احسان فراموش ہے۔ میں نے اُسے عزت دی اور وہ.....“ دادا نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ”عزت اور ذلت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے قلبِ مومن تمہارے ہاتھ میں نہیں۔“ ”آپ اس فلم انڈسٹری کو نہیں جانتے دادا یہاں سب ایک دوسرے کے بارے میں یہی کہتے ہیں ایسے ہی بات کرتے ہیں ایسے ہی گالیاں دیتے ہیں یہاں سب چلتا ہے۔“ مومن نے اب جیسے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

”تو پھر اُس حمام سے نکل آؤ جس میں تم سب بے لباس ہو۔“ اُن کے اگلے جملے نے مومن کو مشتعل کر دیا تھا۔ ”میرا حمام میرے پروفیشن کو کہہ رہے ہیں نا آپ؟“ ”نہیں اُس جسم کو کہہ رہا ہوں جس کی پرستش کروانے کے لئے تم اپنی زندگی ضائع کر رہے ہو۔“ اور مل کیا رہا ہے؟..... حسد، رقابت؟ بے عزتی، بے سکونی ایوارڈز اور آسائشات کے ساتھ۔“

”آپ تو روح کا کام کرتے ہیں ناداد آپ سے تو کوئی حسد نہیں کرتا کوئی دشمن نہیں ہے آپ کا۔“ وہ عبدالعلیٰ پر اب طنز کرنے لگا تھا۔

”میرے کام میں روح ہوتی ہے مومن اور روح ماورا ہے اُن چیزوں سے جن میں تم اُلجھے پڑے ہو۔“ وہ اس بار آگ بگولہ ہوا۔

”میرے کام میں روح نہیں ہوتی وہ صرف آپ کے کام میں ہوتی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں میں روح کو نہیں سمجھتا؟..... کاغذ پر لکھے بے جان کرداروں کو سکریں پر پیش کر کے لوگوں کے دلوں میں اُتار دیتا ہوں اور میں روح کو نہیں سمجھتا۔“ ”تمہارے ان بے جان کرداروں میں سے کس نے کس کی روح کو چھوا؟..... نہیں مومن جو بھی کردار تم پیش کرتے ہو سب جسم ہیں۔ سب لمس مانگتے ہیں..... سب ماؤی..... طلب ہے نفس کی..... اور اُن کا قصور نہیں ہے تمہارا قصور ہے کیونکہ یہ کردار تمہارے ہاتھوں میں گھڑ رہے ہیں اور تمہیں صرف جسم کا پتہ ہے..... روح کا تو پتہ ہی نہیں ہے۔“ جوتا نہیں جوتے مارے تھے اُن کی نرم ہڈی، مدھم آواز میں اور کوڑوں کی طرح اُس کی انا کو زخمی کر گئے تھے۔

”آپ کہتے ہیں ناداد میں روح کو نہیں سمجھتا صرف جسم کو جانتا ہوں اُسی کی پرستش کروا سکتا ہوں..... تو داد اب میں آپ کو ایک ایسی فلم بنا کر دوں گا جو جسم کا لمس نہیں مانگے گی۔ روح کو چھوئے گی..... اللہ کی عبادت کروائے گی۔“ عبدالعلیٰ بے اختیار ہنسنے لگا۔ یوں جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی بچکانہ بات پر ہنستا ہو۔

”ٹھیک ہے مومن اس بار تم ایک فلم بناؤ روح میں اُتر جانے والے کرداروں کی..... اللہ کی عبادت پر مجبور کر دینے والی..... روح کو چھونے والی..... اور جس دن تم اپنی فلم میں روح کی بات کرنے لگو گے یہ لاکھوں، کروڑوں کا مجمع جنہیں تم fan اور followers کہتے ہو یہ چھٹ جائے گا..... یہ سب جنہیں تم دوست کہتے ہو پرندوں کی طرح اڑ جائیں گے۔“ عبدالعلیٰ کی آواز میں عجیب سی کیفیت تھی۔

”ایسا نہیں ہوگا۔“ مومن نے کہا۔ ”تم آزما لو..... پھر جب تم اپنے آپ کو کیلا پاؤ تو یہاں آ جانا۔“

”میں آپ کے پاس صرف روح اور روحانیت پر ایک hit فلم لے کر آؤں گا۔“ قلب مومن نے جواباً کہا۔ ”وہ فلم جو آپ کی خطاطی سے زیادہ قریب کرے گی لوگوں کو اللہ کے۔“ قلب مومن نے چیلنج کیا۔

”تم جیت گئے تو میں کیلی گرائی چھوڑ دوں گا۔ میں جیت گیا تو تم آ جانا میرے پاس اپنا اثاثہ سنبھالنے۔“ عبدالعلیٰ نے مسکراتے ہوئے اُس کا چیلنج قبول کیا تھا۔ وہ اپنی اپنی فیلڈ کے دو پہلوان تھے اور



دروازہ بجانے پر ثریا باہر نکلی تھی اور فیصل کو دیکھ کر اُس کا چہرہ کھل گیا تھا۔ ”ارے بیٹا آؤ..... آؤ..... اندر آؤ۔“ اُس نے دروازے سے ہنستے ہوئے ساتھ اُس کے سلام کا جواب دیا۔ ”نہیں آنٹی بس مومنہ کو لینے آیا ہوں اُسے بھیج دیں۔“ ثریا کے چہرے پر الجھن آئی۔

”مومنہ..... وہ تو کل امریکہ چلی گئی..... کیا تمہیں نہیں بتایا اُس نے۔“ فیصل فریز ہوا تھا۔

”نہیں.....“ اُس نے بمشکل کہا۔ ”پر مجھے تو کہہ رہی تھی کہ تم آؤ گے ویک اینڈ پر تو تمہیں وہ لفافہ دے دوں۔“ ثریا کچھ اور الجھی تھی۔ ”کون سا لفافہ؟“ فیصل بھی الجھا۔ ”ایک منٹ۔“ ثریا کہتے ہوئے برق رفتاری سے اندر گئی پھر اُسی رفتار سے واپس آگئی اور اُس نے ایک لفافہ فیصل کو تھما دیا۔

”ٹھیک ہے آنٹی..... میں چلتا ہوں۔“ فیصل کو بات کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔ ”بیٹا اندر تو آتے..... کچھ چائے وغیرہ.....“ ثریا نے کہا۔ ”نہیں آنٹی پھر کبھی..... ابھی مئی کو کلینک پر بھی چھوڑنا ہے میں نے..... خدا حافظ۔“

وہ رُکے بغیر کہتا ہوا وہاں سے چل پڑا تھا۔ اپنی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہی اُس نے مومنہ کے خط کا جواب بھی سوچتے ہوئے لفافہ کھول لیا تھا۔ اُسے یقین تھا اُس نے اپنے خط میں وضاحتیں دی ہوں گی اور فیصل کو کوئی وضاحت قبول نہیں کرنی تھی۔ لفافے کے اندر کوئی خط نہیں تھا۔ اُس کے اندر پانچ پانچ ہزار کے دونوٹ تھے۔

